دیوانہ گر نہیں ہے تو

(طنز و مزاح)

کنہیالال کپُور

نذیر سنز پبلشرز

40اے اردو بازار لاہور فون:042-37123219

info@nazeersons.com

بانیِ ادارہ: نذیر سنز پبلشرز

والد محترم نذیر حسین 1941 - 2005

اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین

2014

تحسین حسین، محمد شہزاد، محمد عمران

نے نذیر سنز پبلشرز لاہور سے شائع کی

گنج شکر پرنٹرز۔ لاہور

نذیر سنز پبلشرز

40 اے اردو بازار لاہور فون: 042-37123219

info@nazeersons.com

تعارف

کنہیالال کپور کا شمار برصغیر پاک و ہند کے ان ممتاز طنز و مزاح نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی مزاحیہ تحریروں کے ذریعے طنز و مزاح کی نئی نئی جہتیں دریافت کیں۔

ان کی تحریروں میں معاشرے میں پائی جانے والی سماجی برائیوں کے بارے میں بڑے دلگداز، دلنشین، منفرد اور اچھوتے انداز میں نشاندہی کی گئی ہے۔ اور اس ضمن میں انہوں نے اپنی تحریروں میں نہ صرف سماجی برائیوں کی نشاندہی کی ہے بلکہ انہیں تنقیدی نگاہ سے دیکھتے ہوئے بڑی بے دردی اور ہنرمندی کے ساتھ شدید چوٹیں بھی کی ہیں۔ ان کی کہانیوں کو پڑھتے ہوئے ایک سنجیدہ قاری بھی اپنی بے اختیار ہنسی پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ اگرچہ ان کی کہانیوں میں کہیں بھی گہرائی کا عنصر نظر نہیں آتا تاہم معاشرے میں پائی جانے والی برائیوں کی حقیقتیں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ ان کی تحریر میں شگفتگی کے علاوہ کئی ایسی چیزیں بھی مل جاتی ہیں جو سب کی سب کام کی چیزیں ہیں۔ انہی چیزوں کو سامنے رکھتے ہوئے کنہیالال کپور نے آنے والے مزاح نگاروں کو نئی راہوں پر چلنے کا سلیقہ بتلایا ہے۔

آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اس کا تقاضا یہ ہے کہ خود کو زندگی کے جھمیلوں سے آزاد کر کے چند گھنٹوں کے لیے کنہیالال کپور کی کہانیاں پڑھیں اس سے کم از کم یہ ہوگا کہ آپ کا وہ دن بہت اچھا گزرے گا اور آپ آئندہ کے لیے بھی کنہیالال کپور کو پڑھے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

کنہیالال کپور کی طنزیہ، مزاحیہ کہانیوں میں جو ثقافت، کاٹ، نشتریت اور وسعت پائی جاتی ہے وہ شاید اردو کے کسی دوسرے طنز نگار کے ہاں ملنا مشکل امر ہے جو قارئین ظرافت کے عنصر کو پسند کرتے ہیں کنہیالال کپور کی تحریروں کو پڑھ کر ان کی امنگیں مزید جوان ہو جائیں گی اور مسرت و شادمانی ان کی زندگی کا حصہ بن جائے گی۔

☆.....☆.....☆

فہرست

مضامین	صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر
تعارف	3	ادبی مشیر	97
ہدیہ عقیدت	7	دوست رہنما فلسفی	103
کلاؤناش عرف ستیاناس	14	جنگ کی برکتیں	105
دانت نکلوانا	38	واقفیت	108
دیوانہ گر نہیں ہے تو.....	42	نٹ راج	114
ہندوستان دیکھئے	46	پریس کانفرنس	118
میں ڈیڈیو کے لیے کس طرح لکھتا ہوں	52	کہتے ہیں جس کو عشق	123
جانا حاتم طائی کا اسنو مین کی تلاش میں	56	خارستان	126
مشاغل	63	پھر لکھئے	129
چندارے	68	جہاں گرد	137
مجھے میرے بزرگوں سے بچاؤ	76	انکم ٹیکس والے	142
تقریبوں میں شرکت	79	چڑیا گھر	146
مسز ڈوالر	84	مداح	149
کہ پہچانی ہوئی سو حسرت بھی.....	91	عمریں گزرتی گئی	153

خودکشی	159	ایک لیلیٰ ہزار مجنوں	181
بے تکلفی	163	آغا خنجر	185
فریادی	166	کسی طرح خوش رکھا جا سکتا ہے؟	189
کلکتے کا ذکر	170	شوہر کو!	191
عورت، محبت زندگی، انسان	174	حاذق صاحب	194
صداقت	177	ریٹائرڈ لوگ	197

ہدیۂ عقیدت

بات معمولی ہے لیکن اب اس کا کیا کیا جائے کہ کبھی کبھی معمولی بات پر بھی گھر میں جھگڑا ہو جاتا ہے۔ آج صبح ایک نو وارد مجھے ایک تربوز پیش کرنے آیا تھا۔ میں نے شکریہ کے ساتھ اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اب اسی بات پر ایک گھنٹہ سے اہلیہ محترمہ سے بحث چل رہی ہے۔ محترمہ کا خیال ہے کہ میں نے یہ تحفہ واپس کر کے اپنے ایک مداح کی دل شکنی کی ہے۔ لاکھ سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ ایسے تحفے مہنگے پڑتے ہیں لیکن محترمہ ہیں کہ مانتی ہی نہیں۔ اب انہیں کون بتائے کہ دودھ کا جلا چھاچھ کو پھونک پھونک کر پیتا ہے۔

زیادہ عرصہ نہیں گزرا، یہی کوئی ایک سال کی بات ہے کہ اسی طرح ایک نوجوان تشریف لائے۔ میں اس وقت ایک ناول پڑھ رہا تھا۔

''کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟'' انہوں نے اندر داخل ہونے کے بعد پوچھا۔ ''تشریف لے آیئے''۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

''وہ تو میں لے ہی آیا ہوں''۔ انہوں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے فرمایا۔

''معاف کیجئے گا۔ آپ مجھے نہیں جانتے۔ جان بھی کیسے سکتے ہیں جب کہ یہ ہماری پہلی ملاقات ہے۔ خاکسار کو شمس نظامی کہتے ہیں اور بندہ آپ کا غائبانہ مداح ہے۔ بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ آپ سے شرفِ نیاز حاصل کیا جائے لیکن کبھی فرصت ہی نہیں ملی۔ خاکسار نے آپ کی لکھی ہوئی تمام کتابیں پڑھی ہیں اور بندے کی رائے ہے کہ ٹیگور اور پریم چند کے بعد آپ ہندوستان کے سب سے بڑے ادیب، شاعر اور افسانہ نویس ہیں۔

''آپ کی ذرہ نوازی ہے ورنہ میں کیا ہوں''۔ میں نے کسرِ نفسی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''کہئے کیسے تشریف لائے؟''

''بس یونہی آپ سے ملاقات کرنے اور آپ جانتے ہیں کہ ع

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

اس لیے آپ کی خدمت میں ایک ناچیز ہدیہ عقیدت پیش کرنا چاہتا ہوں''۔

یہ کہہ کر انہوں نے اپنے تھیلے سے ایک بہت وزنی ''سردہ'' نکالا۔ اور کہا۔ ''یہ کابل کا سردہ

ہے۔ خاص آپ کے لیے کابل سے منگوایا ہے، میں چاہتا ہوں کہ یہ سالم کا سالم آپ خود کھائیں۔ بخدا مجھے بہت خوشی ہوگی، میں محسوس کروں گا، جیسے یہ سردہ آپ نہیں کھا رہے میں کھا رہا ہوں''۔

''آپ نے خواہ مخواہ تکلف کیا۔ اس کی کیا ضرورت تھی؟''

''نہیں نہیں۔ بالکل نہیں۔ سردہ ہی ہے امرود تو نہیں''۔

''نظام شمسی صاحب!''

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یہ امرود کی بات بھی خوب رہی۔ کہاں سردہ اور کہاں امرود''۔

'جی معاف کیجئے۔ میرا نام نظام شمسی نہیں، شمس نظامی ہے۔ میں ہمیشہ بڑی چیز کا مقابلہ چھوٹی چیز سے کرتا ہوں۔ یہ میری عادت ہے۔ ابھی کل میرے ایک دوست کہنے لگے کہ انہیں ٹائیفائڈ ہو گیا ہے۔ میں نے برجستہ کہا۔ میاں گھبراتے کیوں ہو۔ ٹائیفائڈ ہی ہے زکام تو نہیں۔ ہی ہی ہی۔ کہئے کیسی رہی۔ آپ تو ادیب ہیں۔ داد دیجئے نا اس مزاحیہ فقرے کی''۔

''کیا بات ہے واللہ۔ آپ نے نہایت اچھوتی بات کہی''۔

''آداب عرض!''

''اچھا تو نظام شمسی۔ اوہ معاف کیجئے۔ شمس نظامی صاحب! آپ شغل کیا فرماتے ہیں؟''

''کوئی خاص شغل نہیں۔ میرا مطلب ہے۔ مستقل شغل نہیں۔ طرح طرح کے پاپڑ بیلتا رہتا ہوں۔ کسی زمانے میں معلم تھا۔ پھر چھوٹا سا ہوٹل کھول لیا۔ ہوٹل نہ چلا تو چمڑے کا بیوپار شروع کر دیا۔ اس میں خاص فائدہ نہیں ہوا۔ آج کل تو ایک لانڈری کھول رکھی ہے۔ اسے بھی جلد بند کرنے کا ارادہ ہے۔ پھر کبھی مفصل عرض کروں گا۔ اب اجازت دیجئے۔ آداب عرض''

وہ تشریف لے گئے اور میں سوچنے لگا۔ عجیب قماش کے انسان سے پالا پڑا ہے۔ یا تو بہت سادہ لوح واقع ہوا ہے یا بہت چالاک۔ ممکن ہے اسے ادب سے شغف ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بے چارے کے دماغ کی ایک آدھ چول ڈھیلی ہو۔ بہر حال ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اہلیہ محترمہ سے جب سردے کا ذکر کیا تو ان کی باچھیں کھل گئیں۔ کہنے لگیں۔

''شکر ہے۔ اتنی مدت کے بعد آپ کو ایک کام کا مداح ملا۔ ورنہ بیشتر تو ایسے ملے کہ گھر کو ہوٹل سمجھ کر تین تین دن ضیافتیں اڑائیں اور رخصت ہوتے وقت کرایہ ریل بھی آپ ہی سے طلب کیا ہے''۔

''نہیں نہیں۔آپ مبالغہ سے کام لے رہی ہیں۔میرے مداح ایسے نہیں ہیں۔یاد ہے وہ راجیش''۔

''ہاں ہاں یاد ہے''۔محترمہ نے چمک کر فرمایا۔''وہی جو کہتا تھا کہ آپ کو فلم کمپنی میں ملازمت دلوادوں گا''۔

میں اپنی رسٹ واچ کے بارے میں سوچ کر خاموش ہو گیا جو وہ مجھ سے مانگ لے گئے تھے۔

دو ایک دن کے بعد شمس نظامی صاحب پھر تشریف لائے اور کمرے میں داخل ہوتے ہی کہنے لگے۔''اخاہ خوب ملے۔جلدی سے تیار ہو جایئے،فرسٹ شو شروع ہونے والا ہے''۔

میں نے پوچھا۔''قبلہ بات کیا ہے؟''

ایک بلند قہقہہ لگا کر فرمایا''بات بالکل صاف ہے۔میرے پاس سینما کے دو پاس ہیں۔فرسٹ کلاس کے۔وہ کرشنا ٹاکیز کے منیجر ہیں نالالہ شمبھو دیال،آپ شاید انہیں نہیں جانتے۔آدمی شریف ہیں۔کپڑے میری ہی لانڈری سے دھلواتے ہیں۔میں ایک آدھ کپڑا مفت دھلوا دیتا ہوں اور وہ کبھی کبھار سینما کے پاس بھیج دیتے ہیں۔خیر اب جلدی کیجئے،کہیں فلم شروع نہ ہو جائے''۔

میں کپڑے پہن کر تیار ہو گیا اور وہ مجھے کشاں کشاں کرشنا ٹاکیز لے گئے۔کوئی سٹنٹ فلم تھی۔مار دھاڑ۔جو تم پیزار۔اچھل کود سے بھرپور،مجھے خاک لطف نہ آیا۔لیکن شمس صاحب ہر سین پر کرسی سے اچھل اچھل کر داد دیتے رہے۔فلم دیکھنے کی بجائے میں شمس صاحب کی حرکتوں سے محظوظ ہوتا رہا۔فلم ختم ہونے کے بعد شمس صاحب نے کہا۔

''آپ کو جب بھی سینما جانا ہو مجھے کہلوا بھیجئے گا۔میں فری پاس کا انتظام کر دوں گا''۔

شمس صاحب کا شکریہ ادا کر کے جب میں گھر لوٹا تو ایک بار پھر سوچنے لگا کہ شمس صاحب بڑے عجیب آدمی ہیں۔اب دیکھئے نا بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی کہ مجھے سٹنٹ فلم دکھانے لے گئے۔اہلیہ سے جب اس واقعہ کو ذکر کیا تو انہوں نے کہا۔''بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔معلوم ہوتا ہے۔آپ سے بے پناہ عقیدت ہے ورنہ آج کل کون کسی کا پوچھتا ہے''۔

کوئی دو ہفتے کے بعد شمس صاحب ایک دن یک لخت وارد ہوئے اور آتے ہی کہنے لگے۔

''ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔اگر آپ تھوڑی سی مدد کریں تو کام بن سکتا ہے''۔

''فرمایئے''۔ میں نے کہا۔

''میرا ایک بہنوئی دو سال سے بیکار ہے۔ وہ میرے ہاں ہی ٹھہرا ہوا ہے۔ ایف اے فیل ہے۔ تھوڑا بہت ٹائپ کرنا بھی جانتا ہے۔ ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ایک ٹائپسٹ کی آسامی خالی ہوئی ہے، اگر آپ ڈپٹی کمشنر صاحب سے کہہ دیں.....''

''لیکن شمس صاحب میری تو ڈپٹی کمشنر صاحب سے کوئی واقفیت ہی نہیں ورنہ.....''

''اجی رہنے دیجئے''۔ انہوں نے میری بات کاٹ کر کہا'' بھلا آپ کو کون نہیں جانتا۔ اتنے بڑے ادیب۔ اتنے مشہور شاعر۔ اور پھر وہ ڈپٹی کمشنر ہے کوئی تحصیلدار تو نہیں۔ آپ ایک بار کہیں تو سہی''۔

بہتیرا انہیں سمجھایا کہ میں نے آج تک کسی کی سفارش نہیں کی۔ اور اگر کبھی کی ہے تو کام نہیں بنا۔ لیکن وہ کچھ اس طرح مصر ہوئے کہ محض ٹالنے کی خاطر میں نے کہا'' اچھا ان سے کہہ دوں گا''۔

دس پندرہ دن کے بعد شمس صاحب سے سرِ راہ ملاقات ہوئی۔ بہت خوش نظر آتے تھے، کہنے لگے''۔ دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ آپ کے کہنے سے کام بن جائے گا۔ صاحب نے میرے بہنوئی کو ملازم رکھ لیا حالانکہ ڈیڑھ سو امیدوار تھے..... بہت بہت شکریہ''۔

حالانکہ میں نے ڈپٹی کمشنر سے ذکر تک نہیں کیا تھا۔ لیکن یہ سوچتے ہوئے کہ شمس صاحب مفت میں میرا احسان مان رہے ہیں۔ میں نے بھی رسمی طور پر کہہ دیا۔

''نہیں شمس صاحب! شکریہ کی کیا بات ہے۔ وہ میرا فرض تھا''۔

''دوبارہ شکریہ''۔ شمس صاحب نے کہا۔'' ہاں اگر کوئی گرم کپڑا دھلوانا ہو تو لانڈری میں بھجوا دیجئے گا''۔

اس کے بعد شمس صاحب کافی عرصے تک نہ ملے۔ ایک اتوار کو جب میں حجامت بنا رہا تھا۔ وہ چپکے سے کمرے میں داخل ہوئے اور کہنے لگے۔

''قبلہ غضب ہو گیا''۔

میں نے گھبرا کر پوچھا۔'' معاملہ کیا ہے؟''

''بھئی کچھ نہ پوچھئے''۔

''پھر بھی''۔

''وہ جو میرے بہنوئی تھے۔ یاد ہے نا، جنہیں آپ نے ملازمت دلوائی تھی۔ ان سے ایک بڑی عجیب حرکت سرزد ہوگئی''۔

''کیا مطلب؟''

''انہوں نے دفتر سے ایک ٹائپ مشین چرالی۔ گرفتار کر لیے گئے۔ اب وہ حوالات میں ہیں، عجیب مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ اگر آپ کچھ کرم فرمائی کریں''۔

''لیکن شمس صاحب، میں اس معاملے میں کیا کر سکتا ہوں؟''۔

''آپ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ذرا تھانیدار صاحب سے کہہ دیجئے کہ معاملہ رفع دفع کر دیں''۔

''لیکن میں تھانیدار صاحب کو بالکل نہیں جانتا''۔

''کوئی بات نہیں، وہ آپ کو ضرور جانتے ہوں گے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ آپ جیسے عظیم شاعر اور مشہور ادیب کو نہ جانتے ہوں''۔

''اچھا جلدی کیجئے۔ اٹھئے، وقت بہت تھوڑا ہے''۔

''لیکن قبلہ میں سچ کہتا ہوں۔ میری ان سے بالکل رسم و راہ نہیں''۔

''کوئی بات نہیں۔ میں آپ کا تعارف کرا دوں گا''۔

''ہاں، ذرا وہ ''ماہ تاباں'' کا پرچہ ساتھ لیتے چلئے۔ وہی جس میں آپ کی وہ غزل چھپی ہے۔ میرے انکار کرنے کے باوجود شمس صاحب مجھے تھانیدار صاحب کے پاس لے گئے اور میرا تعارف کراتے ہوئے کہنے لگے۔

''جناب شجر دہلوی سے ملئے۔ آپ اس دور کے سب سے بڑے شاعر، ادیب اور ناولسٹ ہیں۔ آپ نے ان کا نام ضرور سنا ہوگا۔

تھانیدار صاحب نے نہایت بے اعتنائی کے ساتھ کہا''۔

''میں نے تو نہیں سنا''۔

''نام نہیں سنا تو آپ نے ان کا کالم ضرور سنا ہوگا۔ مشاعروں میں تو آپ ضرور جاتے ہوں گے''۔

''جی نہیں'' مجھے اپنے کام سے فرصت ہی کب ملتی ہے کہ مشاعروں میں وقت ضائع کروں''۔

''تو آپ رسائل تو ضرور پڑھتے ہوں گے ''ماہ تاباں'' میں اکثر ان کی غزلیں شائع ہوتی ہیں''۔

''میں ''ماہ تاباں'' نہیں پڑھتا''۔

''خیر کوئی بات نہیں''۔ شمس صاحب نے مایوس نہ ہوتے ہوئے کہا.....

''بہر حال اس سے شجر صاحب کی عظمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ مانے ہوئے ادیب ہیں''۔

''پھر؟.....'' تھانیدار صاحب نے اسی بے رخی سے کہا۔

''یہ آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں''۔

''کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''اکیلے میں کچھ عرض کریں گے''۔

''اچھا تو آپ باہر تشریف لے جائیں''۔

شمس صاحب باہر چلے گئے۔ میں نے تھانیدار صاحب کے پر جلال چہرے سے مرعوب ہو کر ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں شمس صاحب کے بہنوئی کے متعلق کچھ کہا۔ تھانیدار صاحب بہت ناراض ہوئے اور فرمانے لگے کہ پڑھے لکھے آدمیوں کو مجرموں کی سفارش نہیں کرنی چاہیے۔ بات ٹھیک تھی۔ میں ان سے معذرت کر کے باہر آ گیا۔ شمس صاحب نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''کچھ بنا؟''

''میں نے انہیں مبہم الفاظ میں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا''۔

ایک مہینے کے بعد کچھ نہ کچھ یہ ہوا کہ ان کے بہنوئی کو ایک سال قید با مشقت ہو گئی۔ اس کے بعد شمس صاحب کا آنا جانا کچھ کم ہو گیا۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ اب وہ مجھے کبھی سفارش کرنے کے لیے نہیں لے جائیں گے۔

ایک دن صبح کا اخبار پڑھ رہا تھا کہ اچانک نظر ایک سرخی پر پڑی۔ لکھا تھا ''شمس لانڈری پر چھاپہ''۔ خبر پڑھنے پر پتا چلا کہ پولیس نے کل رات شمس لانڈری پر چھاپہ مارا اور چوری کا مال برآمد کیا۔ اور شمس صاحب کے نوکر کو گرفتار کر لیا گیا۔ شمس صاحب روپوش ہیں۔ یہ خبر پڑھ کر حیرانی ہوئی دل نے کہا، شمس صاحب آدمی تو ایسے معلوم نہیں ہوتے۔ خدا جانے یہ کیا بات ہے۔ اہلیہ سے ذکر کیا تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ پولیس کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔

اس واقعہ کے دو تین دن بعد شمس صاحب شام کے وقت میرے گھر آئے۔ نہایت

گھبرائے ہوئے معلوم ہوئے تھے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ لڑکھڑائی ہوئی آواز میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگے۔ ''قبلہ شجر صاحب، سخت وقت آن پڑا ہے۔ مدد کیجئے''۔

''لیکن یہ سلسلہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بات تو کچھ بھی نہیں''۔ انہوں نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ''میرا ایک دوست غلطی سے کسی کی سائیکل اٹھا لایا اور اسے میری لانڈری میں رکھ گیا۔ کسی نے پولیس کو خبر کر دی اور مفت میں میں پھنس گیا۔

''مگر وہ آپ کا دوست کہاں ہے؟''

''لاپتا ہے''۔

''تو پھر؟''

''شک مجھ پر کیا جا رہا ہے۔ میں دو تین دن ادھر ادھر ہو گیا تھا۔ لیکن پھر سوچا کہ بکری کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ سوچا کیوں نہ خود ہی اپنے آپ کو پیش کر دوں''۔

''تو کر دیجئے۔ ہرج ہی کیا ہے؟''

''لیکن ایک ضمانتی کی ضرورت ہے''۔

''کسی دوست سے کہہ دیجئے کہ آپ کی ضمانت''۔

''یہی تو مصیبت ہے۔ کوئی دوست ضمانت دینے کو تیار نہیں''۔

''عجیب بات ہے''۔

''دو ایک لمحے شمس صاحب چپ رہے۔ پھر یک لخت میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگے''۔

''آپ میری ضمانت کیوں نہیں دے دیتے۔ صرف ایک ہزار کی ہی تو بات ہے۔ اور پھر میں ایسا آدمی تو ہوں نہیں کہ آپ کو کسی قسم کا خدشہ ہو''۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں اس جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتا''۔

''دیکھئے''۔ انہوں نے گڑگڑا کر کہا۔ ''اتنے سنگدل نہ بنئے، میری عزت کا معاملہ ہے اور پھر..... اور پھر آپ پر تو میرا خاص حق بھی ہے''۔

شمس صاحب سے کوئی آدھ گھنٹہ بحث کرتا رہا کہ مجھے معذور سمجھیں۔ لیکن وہ کسی طرح بھی

مجھے بخشنے پر رضامند نہ ہوئے۔ آخر یہ سمجھتے ہوئے کہ صرف ایک ہزار کی ضمانت ہے۔ میں رضا مند ہو گیا۔

ضمانت دے دی گئی اور شمس صاحب کو پندرہ تاریخ کو عدالت میں حاضر ہونے کا حکم دیا گیا۔ پندرہ تاریخ ابھی دور تھی۔ اس اثناء میں شمس صاحب دو تین بار میرا شکریہ ادا کرنے آئے۔ ایک دن باتوں باتوں میں انہوں نے بتایا کہ لانڈری کا کام کچھ منافع بخش ثابت نہیں ہوا، اس لیے انہوں نے لانڈری فروخت کر دی۔ اب بیکری کھولنے کا خیال ہے۔

پندرہ تاریخ کی صبح کو میں شمس صاحب کے گھر گیا۔ انہیں یاد دلانے کے لیے کہ آج عدالت میں ان کی پیشی ہے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ کل رات شمس صاحب شہر چھوڑ کر چلے گئے۔ ان کے دوستوں اور واقف کاروں سے پوچھا کہ وہ کہاں گئے۔ کوئی پتا نہ چلا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیٹھے بیٹھائے ایک ہزار کی چپت لگ گئی۔ قصور اپنا ہی تھا۔ اس لیے مصلحتاً اہلیہ محترمہ سے ان کا ذکر نہ کیا۔

وہ دن اور آج کا دن۔ میں ایسے مداحوں سے بہت گھبراتا ہوں جو تحفے تحائف لے کر مجھ سے ملنے آتے ہیں۔ یقیناً آپ اب سمجھ گئے ہوں گے کہ میں نے اپنے نئے مداح کا تربوز کس لیے واپس کر دیا۔ خیر آپ تو سمجھ دار ہیں۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ اہلیہ محترمہ کو کون سمجھائے۔

☆☆☆

کلاؤناش عرف ستیاناس

کردار

سیٹھ دمڑی پرشاد	..... پروڈیوسر
دھوم کیتو	..... ڈائریکٹر
گھسیٹا رام	..... ہیرو
شدگار بیگم	..... ہیروئن
مرزا بوڑم بیگ	..... افسانہ نویس
سرگم شکارپوری	..... شاعر

پہلا منظر: سیٹھ دمڑی پرشاد کا کمرا

(سیٹھ دمڑی پرشاد اخبار پڑھ رہے ہیں۔ دھوم کیتو داخل ہوتا ہے)

دھوم کیتو: نمستے سیٹھ صاحب!

دمڑی پرشاد: (اخبار سے نظریں اٹھا کر بڑی بے رخی سے) نمستے۔

دھوم کیتو: مجھے پہچانا، سیٹھ دمڑی پرشاد جی؟''

دمڑی پرشاد: (سر کو کھجلاتے) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کہیں دیکھا ہے۔

دھوم کیتو: (ہنس کر) واہ سیٹھ صاحب۔ اتنی جلدی بھول گئے؟

اجی میں وہی دھوم کیتو ہوں دھوم کیتو۔ میں آپ کے محلے میں چنا زور گرم بیچا کرتا تھا۔ یاد ہے۔

چنا چرم چرم بولے بابو کھانے کو منہ کھولے
چنا کھاتے سب بنگالی جن کی دھوتی ڈھیلی ڈھالی
چنا زور گرم بابو۔ میں لایا مزیدار چنا زور گرم

دمڑی پرشاد: (پہچانتے ہوئے) اوہ! دھوم کیتو! بھئی خوب ہے، کہو چنا زور گرم کا کیا حال ہے؟

دھوم کیتو: اجی چنا زور گرم کو گولی ماریے۔ اب تو آپ کی دعا سے بندہ فلم لائن میں ہے۔

دمڑی پرشاد: فلم لائن میں چنا زور گرم بیچتے ہو کیا؟

دھوم کیتو: جی نہیں۔ بندہ فلمیں ڈائرکٹ کرتا ہے۔ یعنی بندہ فلم ڈائرکٹر.....''

دمڑی پرشاد: (حیرانی سے) فلم ڈائرکٹر! لیکن تم فلم ڈائرکٹر کیسے بن گئے۔

دھوم کیتو: دیکھئے چنا زور گرم بیچ بیچ کر جب تنگ آ گیا تو میں ایک تھیٹر میں گھنٹی بجانے پر ملازم ہو گیا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ اسی تھیٹر میں پردے کھینچنے لگا۔ وہاں سے جو ترقی کی تو دیواروں پر فلموں کے اشتہار لگانے لگا۔ پھر ایک فلم سٹوڈیو کا دربان بن گیا۔ اب کی بار جو چھلانگ لگائی تو اپنے کو اچھا خاصا ڈائرکٹر پایا۔

دمڑی پرشاد: خوب خوب۔ بہت خوب تم نے تو واقعی کمال کر دیا۔ اچھا یہ کہو کہ تم نے کوئی فلم بھی ڈائرکٹ کی یا نہیں؟

دھوم کیتو: فلموں کی کچھ نہ پوچھئے۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ کوئی ہی کام کی فلم ہو گی جو میں نے

ڈائرکٹ نہیں کی۔

''پان کا بیڑہ'' میں نے ڈائرکٹ کی۔

''حکم کی بیگم'' کا میں خالق ہوں۔

''اینٹ کا بادشاہ'' بھی خاکسار نے بنایا۔ اور ان دنوں ''چڑیا کا غلام'' فلمانے کی فکر میں ہوں۔''

دمڑی پرشاد: خوب۔ خوب تو یوں کہئے کہ آپ نے قریب قریب ساری کی ساری تاش ہی فلمادی ایسا معلوم ہوتا ہے آپ کافی پتے باز ہیں۔

دھوم کیتو: آپ کی نوازش ہے، ورنہ بندہ کس قابل ہے۔

دمڑی پرشاد: اچھا یہ کہئے فلم انڈسٹری میں منافع کی کیا گنجائش ہے۔

دھوم کیتو: گنجائش ہی گنجائش! سیٹھ صاحب! فلم انڈسٹری تو سونے کی کان ہے۔ پانچ لاکھ لگاؤ دس لاکھ کماؤ۔ دس لاکھ لگاؤ بیس لاکھ کماؤ۔ بیس لاکھ لگاؤ چالیس لاکھ کماؤ۔ بس منٹوں میں ہی وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔

دمڑی پرشاد: ہوں! یہ بات ہے؟

دھوم کیتو: جی ہاں! بالکل ٹھیک عرض کر رہا ہوں۔

دمڑی پرشاد: اچھا تو سنو۔ پچھلے دنوں ہم نے مونگ پھلی کے بیوپار میں کافی روپیہ کمایا ہے۔ اگر ہم ایک فلم بنائیں تو کیسی رہے؟

دھوم کیتو: بس یہ سمجھ لیجئے کہ چھ مہینے کے اندر اندر آپ دمڑی پرشاد سے کروڑی پرشاد بن جائیں گے۔

دمڑی پرشاد: واقعی؟

دھوم کیتو: اگر یقین نہ آئے تو آئے تو تجربہ کر لیجئے۔

دمڑی پرشاد: اچھا تو زیادہ سے زیادہ سرمایہ کتنا لگے گا؟

دھوم کیتو: تو پھر لائیے ہاتھ۔ کہو تو آج ہی مہورت کر دیں۔

دمڑی پرشاد: لیکن سٹوری یعنی کہانی کا کیا ہوگا۔

دھوم کیتو: اس کی فکر نہ کیجئے۔ یہ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ میرے ایک دوست ہیں مرزا

بوڑم بیگ۔ایسی کہانی لکھیں گے کہ بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔

دمڑی پرشاد: بوڑم بیگ! عجیب سا نام ہے۔

دھوم کیتو: نام تو عجیب ہے ہی۔شکل اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔بس یوں سمجھ لیجئے کہ ایک دم نہ صرف بوڑم نظر آتے ہیں بلکہ دراصل ہیں بھی بوڑم ہی۔ ہر لحاظ سے بوڑم، میرا مطلب ہے کہ جسمانی اور خاندانی لحاظ سے ان کا کوئی نام ہو سکتا ہے تو وہ بوڑم ہے۔

دمڑی پرشاد: اچھا تو کبھی ان سے ملاقات تو کرائیے۔

دھوم کیتو: آج ہی لیجئے۔میں ابھی ان کو بلوا بھیجتا ہوں۔پہلی ملاقات ہی میں آپ مان جائیں گے کہ ہماری فلم کی کہانی بوڑم صاحب کے علاوہ کوئی نہیں لکھ سکتا۔

دمڑی پرشاد: اور ''گانے'' کون لکھے گا۔

دھوم کیتو: گانوں کا بھی انتظام ہو جائے گا۔میرے ایک دوست ہیں سرگم شکارپوری۔ بخدا گانے لکھتے ہیں کہ جادو کرتے ہیں۔ بھلا چنگا انسان سنے تو اس پر وجد یعنی وحشت طاری ہو جائے۔بس یوں سمجھ لیجئے کہ ایک ایک گانا ایسا ہو گا کہ سارے ہندوستان میں ایک کہرام مچ جائے گا۔

دمڑی پرشاد: ہیرو اور ہیروئن کے متعلق کیا سوچا ہے؟

دھوم کیتو: ہیرو تو کوئی شخص بھی ہو سکتا ہے۔اس کے متعلق سوچنا بے کار ہے، اگر کوئی اور نہ ملا تو خاکسار حاضر ہے۔ہیروئن کے متعلق عرض ہے کہ ایک لڑکی ہے شنگار بیگم۔سیٹھ صاحب ذرا نام ملاحظہ فرمائیے۔شنگار بیگم! میں اسے کبھی جانتا تھا خیر ہٹائیے اسے۔ع

یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

اب تو صاحب مہینوں ملاقات کی نوبت نہیں آتی۔میرا خیال ہے کہ ہیروئن کا پارٹ اسے دیا جائے۔ایکٹنگ تو وہ بالکل نہیں جانتی لیکن شکل وصورت ایسی پائی ہے کہ دیکھیں گے تو اسی دم اس پر لٹو ہو جائیں گے۔اور میری رائے میں ہیروئن میں یہی ایک خوبی ہونی چاہیے۔یعنی آدمی دیکھے تو فوراً.....

دمڑی پرشاد: مجھے آپ سے بالکل اتفاق ہے۔لیکن وہ لے گی کیا؟

دھوم کیتو: لینے دینے کی بات چھوڑیئے۔اس کے پاس پرماتما کا دیا سب کچھ ہے۔وہ تو محض

شوق کی خاطر یا یوں کہئے کہ میری خاطر یا آرٹ کی خاطر یا ہم سب کی خاطر فلم لائن میں آنا چاہتی ہے۔

دمڑی پرشاد: لیکن شنگار بیگم کوئی اچھا نام نہیں۔ کیا اسے بدلا نہیں جا سکتا؟

دھوم کیتو: کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ شنگار بیگم کی بجائے آپ اسے کجلا یا بگلا۔ ریوہ یا میوہ۔ رجنی یا بجنی۔ کوئی بھی نام دے سکتے ہیں میرے خیال میں اسے کوئی بھی عذر نہ ہوگا۔

دمڑی پرشاد: سب سے ضروری بات تو میں نے آپ سے پوچھی ہی نہیں۔

دھوم کیتو: ہاں ہاں فرمایئے۔ ایسی کون سی بات ہے؟

دمڑی پرشاد: آپ فلم ڈائرکٹ کرنے کا کیا لیں گے؟

دھوم کیتو: قہقہہ لگا کر) ہاہاہا۔ بڑی ضروری بات پوچھی آپ نے! بندہ پرور میں تو ڈر رہی گیا تھا۔ دیکھئے لینے دینے کے متعلق عرض یہ ہے کہ مجھے کچھ بھی دے دیجئے لیکن صرف اتنی بات کا خیال رکھیے کہ میری اصل تنخواہ اور پبلسٹی تنخواہ میں کافی فرق ہونا چاہیے۔

دمڑی پرشاد: میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

دھوم کیتو: دیکھئے سیٹھ صاحب۔ فلم لائن میں ہر شخص کی دو تنخواہیں ہوتی ہیں۔ ایک اصلی۔ دوسری پبلسٹی۔ مثال کے طور پر میری اصل تنخواہ تو ہوگی صرف تین سو روپے۔ لیکن میری پبلسٹی تنخواہ ہوگی تین ہزار۔ سمجھے آپ اس نکتے کو؟

دمڑی پرشاد: بالکل۔ بالکل مجھے منظور ہے۔ آپ آج ہی سے فلم کی تیاری شروع کر دیجئے۔

دوسرا منظر

(مرزا بوڑم بیگ کا کمرا)

(دھوم کیتو اور بوڑم بیگ ایک بنچ پر بیٹھے ہوئے ہیں)

دھوم کیتو: (قہقہہ لگا کر) ہاتھ لاؤ استاد بوڑم۔ ایسی مرغی پھنسی ہے کہ وارے نیارے ہو جائیں گے۔

بوڑم بیگ: لیکن یہ سیٹھ دمڑی پرشاد ہیں کون؟ میں نے تو ان کا نام پہلی بار سنا ہے۔

دھوم کیتو: کیا بتاؤں۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ نرے کاٹھ کے الو ہیں، بلکہ میرا تو خیال ہے کہ

انہیں کاٹھ کا الو کہنا بھی بے چارے کاٹھ کے الو کی توہین ہے۔

بوڑم بیگ: لیکن وہ آپ کے جال میں پھنس کیسے گئے؟

دھوم کیتو: (ہنس کر) اجی بوڑم صاحب کاٹھ کا الو نہیں پھنسے گا تو کیا ہم پھنسیں گے۔ خیر، اب آپ جلدی سے ایک کہانی لکھ ڈالیے۔ باقی سب انتظام میں کرلوں گا۔

بوڑم بیگ: کس قسم کی کہانی چاہتے ہیں آپ؟

دھوم کیتو: نام ذرا مزیدار ہونا چاہیے۔ جیسے ''کلاؤ تاش عرف ستیاناس'' پلاٹ ہو چٹ پٹا سا۔ قدم قدم پر محبت۔ منٹ منٹ بعد ایک آدھ بھڑکیلا منظر۔ بس کہانی کیا ہو بارہ مسالے کی چاٹ ہو۔

بوڑم بیگ: آپ تسلی فرمایئے۔ کہانی بالکل ایسی ہی ہوگی کہ ایک بار تو سیٹھ صاحب سُن کر پھڑک اٹھیں گے۔ اگر ہنس ہنس کر باگل نہ ہو جائیں تو نام بدل دیجئے گا۔

دھوم کیتو: اچھا تو اب میں چلتا ہوں۔ آپ کل دس بجے کہانی لے کر سیٹھ صاحب کے یہاں مجھے ملئے۔ پتا نوٹ کر لیجئے۔ 125 چرنی روڈ۔ سرگم شکار پوری کو بھی کہلوا بھیجا ہے۔ وہ بھی گانے لے کر وہاں پہنچ جائے گا۔

تیسرا منظر

(سیٹھ دمڑی پرشاد کا کمرہ)

(سیٹھ دمڑی پرشاد بہی کھاتہ دیکھ رہے ہیں۔ دھوم کیتو اور بوڑم بیگ داخل ہوتے ہیں)

دھوم کیتو: آداب عرض سیٹھ صاحب.....!

مرزا بوڑم بیگ سے ملئے۔ آپ اپنے وقت کے سب سے بڑے سٹوری رائٹر ہیں۔ فلم لائن میں آپ کو مہا لیکھک بوڑم اعظم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اور آپ ہیں سیٹھ دمڑی پرشاد!

بوڑم بیگ: (مصافحہ کرتے ہوئے) بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔

دمڑی پرشاد: (بوڑم سے) تشریف رکھیے۔ مہا بوڑم اعظم لیکھک صاحب۔

بوڑم بیگ: معاف کیجئے گا میرا نام مہالیکھک بوڑم اعظم ہے۔

دمڑی پرشاد: اوہ۔ معاف کیجئے گا بوڑم صاحب۔

دھوم کیتو: سیٹھ صاحب! بوڑم اعظم کہئے۔ محض بوڑم نہیں۔

دمڑی پرشاد: اور! دوبارہ معاف کیجئے۔

دھوم کیتو: سیٹھ صاحب۔ بوڑم اعظم نے ہماری فلم کے لیے کہانی لکھی ہے، کہانی کیا ہے، طمانچہ ہے۔ فلم انڈسٹری کے منہ پر طمانچہ۔ ایسا زبردست طمانچہ کہ فلم انڈسٹری چیخ اٹھے گی۔

دمڑی پرشاد: اوہ! کافی خطرناک کہانی معلوم ہوتی ہے۔

بوڑم بیگ: نہیں نہیں سیٹھ صاحب! آپ تو یونہی گھبرا گئے۔ ذرہ بھر بھی خطرناک نہیں۔ دراصل بات یہ ہے سیٹھ صاحب! کہ میں خالص لٹریچر لکھتا ہوں۔ مطلب یہ کہ میں کہانی ایسی لکھتا ہوں جسے لٹریچر کہا جاتا ہے۔ بس یہی مجھ میں خوبی ہے۔ ویسے لکھنے کو کون کہانی نہیں لکھ رہا۔ چمڑے کے سوداگر کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ جوتے بیچنے والے کہانیاں لکھ رہے ہیں، حتیٰ کہ جوتے چرانے والے بھی کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ کہانی لکھنے کا مرض یوں کہئے کہ وبا کی طرح پھیل رہا ہے۔ لیکن معاف کیجئے میں جو کہانی لکھتا ہوں، وہ خالص لٹریچر ہوتا ہے۔

دمڑی پرشاد: یہ لٹریچر کیا بلا ہوتا ہے۔

بوڑم بیگ: لٹریچر یعنی لٹریچر کو کہتے ہیں۔ جو بالکل جو یعنی۔ جو سو فیصدی۔

دھوم کیتو: ہاں ہاں جو سو فیصدی لٹریچر ہو۔ یعنی جسے ایک بچہ بھی پڑھے تو فوراً پکار اٹھے کہ لٹریچر ہے۔

دمڑی پرشاد: خیر ہوتا ہوگا۔ اچھا تو کیا اس کہانی کا خلاصہ سنا سکتے ہیں؟''

بوڑم بیگ: اسی لیے تو حاضر ہوا ہوں۔ ملاحظہ فرمایئے۔ کہانی کا نام میں نے ڈائرکٹر صاحب کی اجازت سے رکھا ہے:۔
''کلاؤتاش عرف ستیاناس'' پہلے تو یہ کہئے کہ نام پسند آیا؟

دمڑی پرشاد: کافی اچھا نام ہے۔

بوڑم بیگ: شکریہ شکریہ! مجھے معلوم تھا کہ نام ضرور پسند آئے گا۔ کہانی بھی ضرور پسند آئے گی۔

دمڑی پرشاد: پہلے ذرا سنا تو دیجئے کہ کہانی کس قسم کی ہے؟

بوڑم بیگ: کہانی کی کچھ نہ پوچھئے۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ...... کہ......

دھوم کیتو: کہ سو فیصدی لٹریچر ہے۔

دمڑی پرشاد: مجھے کہانی سنائیے۔ لٹریچر۔ وٹ ریچر رہنے دیجئے۔

بوڑم بیگ: بہت اچھا۔ تو سنئے۔ کہانی کا ہیرو پریم کمار جو پریم نگر کا رہنے والا ہے، اپنے ہمسائے پریم ناتھ کی نوجوان لڑکی پریم کماری سے پریم کرتا ہے۔

دھوم کیتو: کیا کہنے۔ کیا کہنے بوڑم صاحب کیا بات پیدا کی ہے۔

بوڑم بیگ: آداب عرض...... ہاں صاحب۔ تو پریم کمار پریم کماری سے پریم کرتا ہے۔ لیکن وہ اس انداز سے پریم کرتا ہے کہ کسی کو پتا نہیں چلنے دیتا کہ آیا وہ پریم کر رہا ہے یا پاگل خانے جانے کی تیاری...... کبھی اپنی محبوبہ کو دیکھ کر ہنسنے لگتا ہے کبھی رونے لگتا ہے۔ کبھی ڈاڑھی بڑھا لیتا ہے، کبھی مونچھیں کٹوا دیتا ہے۔ کبھی سرد سرد آہیں بھرتا ہے اور کبھی گرم گرم پکوڑے کھاتا ہے۔

دمڑی پرشاد: کیا کہنے۔ کیا کہنے۔ واقعی محبت کا یہ اندازہ بہت نرالا ہے۔

بوڑم بیگ: ابھی کیا سنا ہے آپ نے۔ ذرا آگے چل کر دیکھئے۔ کیا کیا گل کھلتے ہیں۔ جی ہاں۔ تو صاحب پہلا گل یہ کھلتا ہے کہ پریم کماری کی ماں کو اس چوری چھپے کی محبت کا علم ہو جاتا ہے اور وہ پریم کماری کو مار مار کر، مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیتی ہے۔

دمڑی پرشاد: بہت خوب۔ ایسی لڑکیوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہونا چاہیے۔

بوڑم بیگ: جی ہاں۔ دراصل اس سین کا مطلب یہ ہے کہ نوجوان لڑکیوں کو عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ یعنی انہیں چھپ چھپ کر اپنے ہمسائے کے لڑکے سے محبت نہیں کرنی چاہیے۔

دمڑی پرشاد: کھلم کھلا محبت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

بوڑم بیگ: یہ میں پھر کبھی آپ کو بتاؤں گا کیونکہ کھلم کھلا محبت کا اپنی کہانی سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں صاحب تو پریم کماری کو ایک کمرے میں بند کر دیا جاتا ہے اور یہاں پریم کمار اور پریم کماری مل کر ایک دوگانا گاتے ہیں۔

دمڑی پرشاد: لیکن پریم کمار بند کمرے میں کیسے آ گیا؟

دھوم کیتو: سیٹھ صاحب اسے سمجھنا آپ کے بس کا روگ نہیں۔ یہ ٹیکنیکل پوائنٹ ہے۔ کئی لوگ اسے کیمرا ٹرک (Camera trick) بھی کہتے ہیں۔ خیر آپ کی جانے بلا۔ بس آپ فرض کر لیجئے کہ پریم کمار بند کمرے میں آ جاتا ہے۔ ورنہ دو گانے ..... ورنہ دو گانے کا (سرگم شکار پوری: کمرے میں داخل ہوتے ہوئے) ورنہ..... دو..... گانے کا ستیاناس ہو جائے گا۔

دمڑی پرشاد: (سرگم کی طرف دیکھتے ہوئے) آپ کون ہیں؟

دھوم کیتو: اوہ! آپ ہیں سرگم شکار پوری۔ اپنے دور کے سب سے بڑے شاعر۔ مہاکوی۔ شاعر اعظم۔ سرگم شکار پوری صاحب۔

دمڑی پرشاد: (سرگم کی طرف غ سے دیکھنے کے بعد) آپ تو مجسم ہارمونیم نظر آتے ہیں۔

سرگم شکار پوری: شک شک۔ شک شکریہ۔ شکریہ، دراصل میرا نام پن پن پنڈت رونقی رام رونق ہے۔ لیکن میرے سب دو..... دو دوست مجھے سرگم ش ش شکار پوری کہتے ہیں۔ یہاں تک کہ میری بی..... بی..... بیوی بھی سرگم ڈا..... ڈا..... ڈارلنگ کہنے لگی ہے۔

دھوم کیتو: سرگم صاحب ہمیں اپنی فلم کے لیے ایک مزید اردو گانے کی ضرورت ہے۔ کیا آپ کے پاس کوئی ایسا دوگانا ہے؟

سرگم شکار پوری: اجی صاحب..... دوگانے تو مجھ سے تھو..... تھو..... تھوک کے بھاؤ لے لیجئے۔ جو۔ جو۔ جوتا پہنتے پہنتے دوگانا لکھ ڈالتا ہوں۔

دھوم کیتو: سچوایشن (Situation) اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ ہیروئن کو اس کی ماں نے بیدردی سے بیٹا ہے۔ وہ ایک کمرے میں بند کر دی جاتی ہے جہاں ہیرو صاحب چاندنی رات میں اس سے ملتے ہیں اور ملنے سے بیشتر دو گانے کا پہلا بول گاتے ہیں۔

سرگم شکار پوری: سچ، سچ۔ سچ۔ سچوایشن میں نے بالکل سمجھ لی ہے دراصل مے۔ مے میرا واسطہ اس قسم کی سچ، سچ، سچ۔ سچوایشنز سے ہی اکثر رہتا ہے۔ یہ دیکھیے میں نے فل۔ فل فلمی گانوں کی چھ فائلیں تیار کر رکھی ہیں۔ پہلی فائل کا نام ہے۔ پ۔ پ۔ پ پریم کے گانے، ان گانوں میں پریم ہی پریم ہے۔ دوسری فائل ہے مو..... مو..... موت کے گانے۔ ان گانوں میں موت ہی موت ہے۔ تیسری فائل شا۔

شا۔شادی کے گانے اور چوتھی بربادی کے گانے۔ پانچویں میں ہیں ق ق ق
قوالیاں اور چھٹی ابھی خاخا خالی پڑی ہے۔

دھوم کیتو: بہت خوب، بہت خوب۔ اچھا کوئی مزید اردو گانا سیٹھ صاحب کو ذرا ترنم کے ساتھ سنایئے۔

سرگم شکارپوری: سنیے صاحب!

جگ جگ جگمگاتی رات میرا چندا میرے ساتھ
اماں سو رہی ہے
جھل جھل جھلملاتی رات میری گھڑی بجائے سات
منی رو رہی ہے۔

دمڑی پرشاد: معاف کیجئے گا سرگم صاحب۔ لیکن منی کے رونے کا اس دوگانے سے کیا تعلق ہے؟

سرگم شکارپوری: واہ واہ سیٹھ صاحب۔ آپ یہ بھی نہیں سمجھ پائے۔ بن بن۔ بن بندہ پرور! اس دو گانے میں، میں نے چاند۔ چاند چاندنی رات کا نقشہ پیش کیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جب ام، ام، اماں سوتی ہے تو منی رویا کرتی ہے۔ دوسرے بچے سا۔ سات بجے کے قریب ضرور روتے ہیں۔ کیونکہ اس وقت انہیں بھو۔ بھو بھوک لگتی ہے۔

دھوم کیتو: واہ سرگم صاحب۔ واہ واہ! کیا نکتہ پیدا کیا ہے۔

سرگم شکارپوری: آداب عرض۔ کہئے دوگانا پسند آیا؟

دھوم کیتو: اچھا ہے کافی اچھا ہے۔ ایک آدھ اور سنا دیجئے۔

سرگم شکارپوری: سنئے عرض کیا ہے:

ٹن ٹن ٹن۔ میرا بھو۔ بھو۔ بھولا بجن
ہائے میں کیا کروں، ہائے میں کیا کروں
ٹم ٹم ٹم۔ میرا بھولا بلم
میں تو آہیں بھروں۔ ہائے آہیں بھروں
چھم چھم چھم۔ مجھے کھائے یہی غم
کیسے پیار کروں۔ ہائے پیار کروں

دھوم کیتو: بہت خوب سرگم صاحب۔ آپ نے تو قلم توڑ کر رکھ دیا ہے۔

سرگم شکار پوری: اجی تو۔ تو توڑا کہاں ہے۔ وہ کم کم بخت تو ابھی میری جیب میں سلامت پڑا ہے۔

دمڑی پرشاد: سرگم صاحب۔ آپ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، دوگانا لکھنے میں تو آپ کو کمال حاصل ہے۔

سرگم شکار پوری: بن بن بن بندہ نوازی ہے۔ ورنہ خاخاخا کسار کس قابل ہے۔

دھوم کیتو: ہاں تو سیٹھ صاحب باقی کہانی بھی سن لیجئے۔ بوڑم صاحب انتظار کر رہے ہیں۔

دمڑی پرشاد: ہاں بوڑم صاحب باقی کہانی سنا دیجئے۔

بوڑم بیگ: ہاں صاحب تو پریم کماری کو جب کمرے میں بند کیا جاتا ہے اور پریم کمار اس سے ملاقات کرنے کے بعد گھر جاتا ہے تو عین اس وقت کہیں قریب سے گھڑی بارہ بجاتی ہے اور دور سے الو کی چیخ سن کر پریم کماری بے ہوش ہو جاتی ہے۔

دھوم کیتو: کیا کہنے۔ کیا کہنے۔ یہ بالکل نیا ٹچ ہے۔ کم از کم میں نے کسی فلم میں نہیں دیکھا۔ کہ الو کی چیخ سن کر ہیروئن بے ہوش ہو جائے۔

بوڑم بیگ: جی ہاں۔ یہ بالکل انوکھا ٹچ ہے۔ تو صاحب۔ جب صبح پریم کماری کی ماں دروازہ کھولتی ہے تو کیا دیکھتی ہے۔ کیا دیکھتی ہے کہ پریم کماری غائب ہے اور اس کی بجائے بستر پر ایک بڑا سا الو سو رہا ہے۔

دمڑی پرشاد: (حیرانی سے) ہائیں! لڑکی کی بجائے الو۔

بوڑم بیگ: جی ہاں الو! بالکل الو! یعنی ایک دم الو اس ٹچ سے میں نے (Suspense) پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

دھوم کیتو: اور حق تو یہ ہے کہ خوب (Suspense) پیدا کی ہے۔

بوڑم بیگ: الو کو دیکھ کر پریم کماری کی ماں بے ہوش ہو جاتی ہے۔ اسے ہسپتال میں پہنچایا جاتا ہے جہاں ہوش میں آنے کے بعد وہ ایک کمپونڈر سے محبت کرنے لگتی ہے۔

دمڑی پرشاد: شادی شدہ عورت کمپونڈر سے محبت کرنے لگتی ہے۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

بوڑم بیگ: سیٹھ صاحب۔ شاید میں نے آپ کو نہیں بتایا کہ پریم کماری کی ماں بیوہ ہے۔ دراصل میں اس کہانی میں ایک بڑے نازک سماجی مسئلے کا حل پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میری مراد دوسرا واہ سے ہے۔

دمڑی پرشاد: ہاں تو اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟

بوڑم بیگ: اس کے بعد ایک عجیب واقعہ پیش آتا ہے۔ پریم کمار، پریم کماری کی کھوج میں گھر سے نکلتا ہے۔ شہر سے دور اور شمشان کے قریب اس کی ملاقات ایک بدصورت عورت سے ہوتی ہے جسے دیکھ کر پریم کمار بے ہوش ہو جاتا ہے، اسے ہسپتال لے جایا جاتا ہے۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ پریم کماری کی ماں سے جو کہ اس ہسپتال میں نرس بنی ہوئی، لڑنے لگتا ہے۔

دمڑی پرشاد: اس کے بعد؟

بوڑم بیگ: اس کے بعد وہ ایک بار پھر پریم کماری کی تلاش میں روانہ ہوتا ہے۔ ایک شہر سے دوسرے شہر۔ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں۔ ہر راہ گیر کو روک کر پوچھتا ہے۔ کیا تم نے پریم کماری کو دیکھا ہے۔ کیا تم پریم کماری کو جانتے ہو۔ کیا تم مجھے پریم کماری کے پاس لے چلو گے؟''

دھوم کیتو: بہت خوب۔ بہت خوب۔ یہ واقعی بڑا ڈرامیٹک ٹچ ہے۔

بوڑم بیگ: جی ہاں۔ پریم کمار یہ سوال اتنی بار کرتا ہے کہ اس کا گلا بیٹھ جاتا ہے۔ وہ ایک بار پھر ہسپتال میں جاتا ہے اور اپنے گلے میں دوا لگوا کر پریم کماری کی ماں کے نئے خاوند سے ہاتھ پائی کرنے لگتا ہے۔ دونوں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں۔ اس لڑائی میں ہسپتال کی شیشیاں، میزیں کرسیاں توڑی جاتی ہیں۔ آخر ہسپتال کا بڑا ڈاکٹر بیچ بچاؤ کر کے دونوں کی صلح کرا دیتا ہے۔

دمڑی پرشاد: پھر کیا ہوتا ہے؟

بوڑم بیگ: ہسپتال سے آنے کے بعد پریم کمار بالکل مایوس ہو جاتا ہے اور خودکشی کرنے کے ارادے سے قطب منار پر چڑھنے لگتا ہے۔

دھوم کیتو: میرے خیال میں آج تک کسی فلم میں قطب مینار سے کود کر خودکشی کرنے کا منظر نہیں دکھایا گیا۔

بوڑم بیگ: جی ہاں۔ آپ کا خیال بالکل صحیح ہے۔ ہاں صاحب تو جب پریم کمار قطب منار کی آخری منزل پر پہنچتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک نوجوان اس سے پہلے خودکشی کرنے

کی غرض سے کھڑا ہے، یہ نوجوان دراصل پریم کماری ہے۔

سرگم شکار پوری: پ۔پ۔پ۔ پریم کماری ہے۔ واہ واہ۔ بولو بوڑم صاحب کیا بات ہے۔

بوڑم بیگ: جی ہاں پریم کماری ایک لڑکے کے بھیس میں وہاں کھڑی ہے۔ آنکھوں سے آنکھیں چار ہوتی ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں اور وہیں کھڑے کھڑے ایک دوگانا گاتے ہیں۔

دمڑی پرشاد: بہت خوب۔ لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ گھر سے غائب ہونے کے بعد پریم کماری کہاں جاتی ہے۔

بوڑم بیگ: سیٹھ صاحب! یہی تو اس کہانی کی سب سے بڑی خوبی ہے، فلم دیکھنے والے سوچ سوچ کر پاگل ہو جائیں گے پریم کماری کہاں گئی۔ لیکن انہیں کچھ پتا نہیں چلے گا۔ اس نچ سے تو میں نے زبردست (Suspense) پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیوں ڈائرکٹر صاحب کیا خیال ہے آپ کا؟

دھوم کیتو: بوڑم صاحب آپ بجا فرماتے ہیں۔ دراصل جب تک کہانی میں (Suspense) نہ ہو وہ بالکل بے کار ہے اور آپ کی کہانی میں تو (Suspense) اس قدر ہے۔ اس قدر ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں (Suspense) کے علاوہ اور کچھ ہے ہی نہیں۔

بوڑم بیگ: آداب عرض۔ آداب عرض۔

دمڑی پرشاد: میرے خیال میں کہانی میں کافی جان ہے۔

بوڑم بیگ: اجی صاحب! جان کیسے نہ ہو گی۔ اس میں پندرہ (Climax) ہیں۔ 36 (Accidents) ہیں اور چالیس گانوں کی گنجائش ہے اور پھر سب سے بڑی خوبی یہ کہ ایک دم کامیڈی۔ شروع سے آخر تک (Comedy) یعنی ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے۔ گولڈن نہیں تو سلور جوبلی تو ضرور منائے گی۔

سرگم شکار پوری: ہاہاہاں صاحب کیوں نہیں منائے گی۔ آپ کی دعا سے ایک گانا ایسا ہو گا کہ ہٹ سانگ، ہر کوچوان، ہر ٹیکسی ڈرائیور۔ ہر نتھو خیرا اسے گاتا نہ پھرے تو سرگم نام نہیں۔

دھوم کیتو: اور ڈائرکشن ایسی ہوگی سیٹھ صاحب کہ لوگ دانتوں تلے انگلیاں دبائے پھریں گے۔ آپ کی دعا سے ایسے ٹیچ ہوں گے کہ ہالی وڈ سے چل کر لوگ اسے دیکھنے آئیں گے۔

دمڑی پرشاد: اگر یہ بات ہے تو آپ پرماتما کا نام لے کر شوٹنگ شروع کر دیجئے، روپے کی پروانہ کیجئے۔ پانی کی طرح بہائیے۔ لیکن ایک دفعہ فلم ایسی بنا دیجئے کہ چوگنے نہیں تو کم از کم تگنے تو ضرور ہو جائیں۔

دھوم کیتو: آپ تسلی رکھئے سیٹھ صاحب..... ہاں کوئی اور بات؟

دمڑی پرشاد: اور تو کوئی خاص بات نہیں۔ ہاں..... آپ نے ابھی شنگار بیگم سے ملاقات نہیں کرائی۔

دھوم کیتو: اوہ شنگار بیگم۔ میں نے اسے کہہ دیا ہے۔ دو ایک دن میں وہ آپ سے ملنے کے لیے آئے گی۔

دمڑی پرشاد: اچھا تو اب آپ لوگ جا سکتے ہیں۔

دھوم کیتو: بوڑم بیگ۔ سرگم شکارپوری: آداب عرض!

چوتھا منظر

دھوم کیتو کا کمرا

(دھوم کیتو گھنٹی بجاتا ہے۔ چپراسی اندر آتا ہے)

دھوم کیتو: (چپراسی سے) دیکھو۔ ہم نے کچھ لیکھک مکالمے لکھنے کے لیے بلائے ہیں۔ انہیں باری باری اندر بھیج دو۔

چپراسی: بہت اچھا سرکار

(ایک لیکھک اندر آتا ہے)

لیکھک: آداب عرض۔

دھوم کیتو: آداب عرض

لیکھک: کیا میں بیٹھ سکتا ہوں۔

دھوم کیتو: نہیں آپ کھڑے ہی رہیں تو بہتر ہوگا۔ آپ کا نام؟

لیکھک: نوین چندر

دھوم کیتو: تعلیم؟

لیکھک: ایم،اے۔ایل ایل۔بی۔پی۔ایچ۔ڈی۔

دھوم کیتو: آپ سے کس مسخرے نے کہا کہ آپ مکالمے لکھا کریں۔

لیکھک: کیوں صاحب مجھ میں کیا نقص نظر آیا آپ کو؟ میں چھ کتابوں کا مصنف ہوں۔ کافی تعلیم یافتہ ہوں۔ میں مکالمے کیوں نہیں لکھ سکتا؟

دھوم کیتو: برخوردار! فلمی مکالمے لکھنے کے لیے تعلیم کی ضرورت ہے نہ لیاقت کی۔ اس کے لیے ضرورت ہے لاعلمی اور ناواقفیت کی۔ یعنی جسے ہم دوسرے لفظوں میں فلمی تجربہ کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے آپ تشریف لے جائیں۔

(چپراسی سے) دوسرے امیدوار کو بلاؤ۔

چپراسی: بہت اچھا سرکار۔

(دوسراامیدوار راخل ہوتا ہے)

دوسراامیدوار: نمستے ڈائرکٹر صاحب

دھوم کیتو: نمستے، آپ کی تعلیم؟

دوسراامیدوار: مڈل فیل ہوں۔

دھوم کیتو: بہت خوب تجربہ؟

دوسراامیدوار: میں نے دس فلموں کے مکالمے لکھے ہیں۔

دھوم کیتو: ان فلموں کے نام بتایئے۔

دوسرا امیدوار: ان فلموں کے نام ہیں ''لگر بگڑ''۔ ''خونی چیتا''۔ ''شمشان''۔ ''قبرستان کا بھوت''۔ ''شریر بندر''۔ ''کالا چور''۔ ''بھوراہاتھی''۔ وغیرہ وغیرہ۔

دھوم کیتو: اچھا فلم ''وغیرہ وغیرہ'' کے مکالموں کا ایک نمونہ سنایئے۔

دوسراامیدوار: ملاحظہ فرمایئے۔ رمیش اس فلم کا ہیرو ہے۔ اور نیلما، ہیروئن۔ رمیش نیلما سے کہتا ہے۔ نیلما۔ نیلما۔ او نیلما جب تم مجھے نظر نہیں آتیں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں اندھا ہو گیا ہوں، جیسے ساری دنیا میں اندھیرا چھا گیا ہے۔ اور سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا ہے۔

دھوم کیتو: کیا کہنے۔ کیا کہنے۔ اور نیلما کیا کہتی ہے؟

دوسرا امیدوار: نیلما کہتی ہے۔ رمیش اور جو میری حالت ہوتی ہے۔ کاش وہ میں بیان کر سکتی بس یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے کہ میں ایک دم پاگل ہو گئی ہوں۔ جیسے میری رو کے ویرانے میں الو بول رہے ہیں، چمگادڑیں چکر لگا رہی ہیں۔ اور مر اذانیں دے رہے ہیں۔

دھوم کیتو: خوب، بہت خوب مرغ اذانیں دے رہے ہیں اور چمگادڑیں چکر لگا رہی ہیں۔ واقعی جواب نہیں۔ بخدا کیا فقرے لکھ گئے ہیں آپ۔

دوسرا امیدوار: آپ کی عنایت ہے ورنہ میں.....

دھوم کیتو: آپ یہ کہانی لے جایئے اور اس کے مکالمے لکھ ڈالیے۔

دوسرا امیدوار: معاوضہ کیا ملے گا؟

دھوم کیتو: مکمل مکالمے لکھنے کے آپ کو تین سو روپے ملیں گے۔ اس میں سے سو روپیہ میری کمیشن ہوگی۔ دس روپے پیشگی لے جایئے اور باقی کام ختم ہونے پر۔

دوسرا امیدوار: یہ تو بہت تھوڑا ہے۔

دھوم کیتو: تھوڑا؟ معلوم ہوتا ہے آپ بڑے لالچی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ فلم "پان کا پتہ" کے مکمل مکالمے میں نے پچاس روپے میں لکھوائے تھے اور اینٹ کی بیگم کے صرف پچھتر روپے میں۔

دوسرا امیدوار: کچھ بڑھا دیجئے۔

دھوم کیتو: ایک پائی نہیں۔

دوسرا امیدوار: جی۔ غریب آدمی۔

دھوم کیتو: ارے میاں۔ دنیا میں کون غریب نہیں۔ ہم کون سے لکھ پتی ہیں۔ اچھا منظور ہیں تین سو روپے؟

دوسرا امیدوار: جی مگر لیکن۔

دھوم کیتو: لیکن ویکن کچھ نہیں۔ منظور ہیں تو کہئے نہیں تو.....

دوسرا امیدوار: جی مجھے منظور ہیں۔

دھوم کیتو: یہ لیجئے کہانی.....

(چپراسی سے) باقی لیکھکوں سے کہہ دو کہ وہ جا سکتے ہیں۔

چپراسی: بہت اچھا سرکار۔

پانچواں منظر

(سیٹھ دمڑی پرشاد کا کمرا)

شنگار بیگم: میں اندر آ سکتی ہوں۔

دمڑی پرشاد: کون؟ اوہ ہاں ہاں تشریف لائیے۔

شنگار بیگم: آداب عرض۔

دمڑی پرشاد: آداب عرض۔ آپ کی تعریف؟

شنگار بیگم: میں ہوں شنگار بیگم۔ یعنی کملا یا گملا۔ ریوہ یا میوہ یا جو کچھ بھی آپ مجھے کہنا چاہیں۔

دمڑی پرشاد: اوہ! آپ ہیں ہماری فلم کی ہیروئن۔

شنگار بیگم: جی ہاں۔ جی ہاں۔

دمڑی پرشاد: بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ واقعی آپ شنگار بیگم ہیں۔ بلکہ آپ کو تو شنگار بکس کہنا چاہیے۔

شنگار بیگم: شکریہ۔

دمڑی پرشاد: آپ کی عمر کیا ہوگی بھلا؟

شنگار بیگم: پچھلے دس برس سے میری عمر تیس سال چلی آ رہی ہے، ویسے لگتی میں اٹھارہ برس کی ہوں۔

دمڑی پرشاد: اس میں کیا شک ہے۔ بلکہ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے آپ ابھی دودھ پیتی بچی ہیں۔

شنگار بیگم: آپ کے علاوہ ڈائرکٹر صاحب کا بھی یہی خیال ہے۔

دمڑی پرشاد: آپ کیسے تشریف لائیں؟

شنگار بیگم: آپ کی کشش کھینچ لائی۔

دمڑی پرشاد: (توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) ہماری کشش؟ (قہقہہ لگا کر) ہاہاہاہا تو گویا ہم میں بھی کوئی ایسی چیز ہے جو لوگوں کو ہماری طرف کھینچتی ہے۔

شنگار بیگم: ہاں صاحب اس میں کیا شک ہے۔

دمڑی پرشاد: اچھا چائے پیجئے گا یا شربت؟

شنگار بیگم: جی میں صرف سگریٹ پیوں گی۔

دمڑی پرشاد: (بیڑی پیش کرتے ہوئے) لیجئے یہ بیڑی حاضر ہے۔ شوق فرمائیے۔

شنگار بیگم: جی معاف کیجئے میں بیڑی نہیں پیتی۔

دمڑی پرشاد: کوئی بات نہیں۔ آئندہ جب آپ تشریف لائیں گی، سگریٹ کا انتظام کر دیا جائے گا۔

شنگار بیگم: شکریہ!

دمڑی پرشاد: اچھا آپ رہنے والی کہاں کی ہیں؟ اور فلم لائن میں کب سے ہیں؟

شنگار بیگم: جی میں لکھنؤ کی رہنے والی ہوں۔ گانا بجانا الہ آباد میں ہی سیکھا۔ ناچنا بمبئی میں۔ کار چلانا کلکتے میں اور تیرنا رنگون میں۔

دمڑی پرشاد: اوہ! آپ نے تو گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ کافی تجربہ کار معلوم ہوتی ہیں۔

شنگار بیگم: سب آپ کی عنایت ہے۔

دمڑی پرشاد: اچھا تو پھر ایک آدھ گانا ہو جائے۔

شنگار بیگم: معاف کیجئے اس وقت گانے کا موڈ نہیں۔ پھر کبھی سنا دوں گی۔ اچھا اب اجازت دیجئے۔

دمڑی پرشاد: اجازت دینے کو تو جی نہیں چاہتا۔ لیکن خیر۔ اب آپ جا سکتی ہیں۔

شنگار بیگم: جانے سے پہلے ایک بات پوچھ سکتی ہوں۔

دمڑی پرشاد: ہاں ہاں بڑے شوق سے۔

شنگار بیگم: کیا میں آپ کو اچھی لگتی ہوں؟

دمڑی پرشاد: ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔

شنگار بیگم: کیا میں خوب صورت ہوں۔

دمڑی پرشاد: کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ کم از کم میری سیٹھانی سے تو زیادہ خوب صورت ہو۔

شنگار بیگم: شکریہ۔ آداب عرض۔

دمڑی پرشاد: آداب عرض۔ کبھی کبھی، ضروری ملا کیجئے۔

شنگار بیگم: (مسکرا کر) کبھی نہیں ہر روز۔

دمڑی پرشاد: (قہقہہ لگا کر) ہاں۔ یہ ٹھیک ہے• ہر روز۔ ہر روز۔

چھٹا منظر

(دھوم کیتو کا دفتر)

(دھوم کیتو کے دائیں طرف گھسیٹا رام یعنی ہیرو اور بائیں طرف شنگار بیگم یعنی ہیروئن بیٹھے ہوئے ہیں۔ میز پر شربتِ بنفشہ کی بوتل اور تین گلاس رکھے ہوئے ہیں۔ گھسیٹا رام کے بال بڑھے ہوئے ہیں۔ لباس میلا۔ حلیہ عجیب وغریب۔ شنگار بیگم کا لباس بھڑکیلا)

دھوم کیتو: (شربت کا گلاس اٹھاتے ہوئے) شربتِ بنفشہ زکام کے لیے تو اکسیر ہے۔

شنگار بیگم: ایک دم اکسیر ہے۔ ادھر حلق سے نیچے اترا اور ادھر زکام بالکل غائب۔

گھسیٹا رام: کئی بار تو پنسلین سے بھی تیز ثابت ہوتا ہے۔

دھوم کیتو: آپ شاید نہیں جانتے کہ پنسلین بھی بنفشے کے پھولوں سے تیار کی جاتی ہے۔

گھسیٹا رام: جی اچھی طرح جانتا ہوں۔ میرے ایک ماموں مویشیوں کے ہسپتال میں چپراسی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ بنفشے کے پھولوں کے علاوہ دھتورے سے بھی پنسلین تیار کی جا رہی ہے۔

شنگار بیگم: (ہنس کر) ہی ہی ہی۔ دھتورے سے۔ دھتورا تو بہت زہریلا ہوتا ہے۔

گھسیٹا رام: پنسلین بھی کم زہریلی نہیں ہوتی۔ میرے ماموں کا کہنا ہے کہ اگر ایک بھینس کو چھ اونس پلا دی جائے تو وہ تڑپ تڑپ کر مر جائے گی۔ کیوں ڈائرکٹر صاحب کیا خیال ہے آپ کا؟

دھوم کیتو: ارے بھئی میں ڈائرکٹر ہوں۔ ڈاکٹر نہیں۔ اچھا چھوڑیئے قصہ۔ اب ذرا کام کی باتیں کریں۔ آپ کو معلوم ہے۔ میں نے آپ کو کس لیے بلایا ہے؟

شنگار بیگم: شربتِ بنفشہ پینے کی لیے۔

دھوم کیتو: (گھسیٹا رام سے) پہلی ہدایت آپ کو دی جاتی ہے کہ آپ اپنا حلیہ ذرا بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ آپ نے بال بری طرح سے بڑھا رکھے ہیں، ہمت کر کے آج

انہیں تر شوالیجئے۔اور ہاں یہ میلی بش شرٹ بھی بدل لیجئے۔اگر آپ کے پاس صرف ایک بش شرٹ ہے تو اسے ڈبل ریٹ پر دھلوا لیجئے۔اور ہاں گھٹیا سگریٹ پینا چھوڑ دیجئے آپ ہماری فلم کے ہیرو ہیں۔ہیرو کو گھٹیا۔''

گھسیٹارام: جی میں آپ کی ہدایت بالکل سمجھ گیا۔

دھوم کیتو: (شوگار بیگم سے) اور آپ بھڑ کیلے کپڑے پہننا چھوڑیئے، اگر بال بنانے کا ڈھنگ نہیں آتا تو کسی سے سیکھنے کی کوشش کیجئے اور میک اپ کرتے وقت خیال رکھیئے کہ کچھ پاوڈر ڈبے میں باقی رہ جائے۔سارا آپ کے چہرے کی نظر نہ ہو جائے۔سمجھیں آپ؟

شوگار بیگم: جی ہاں بالکل سمجھ گئی۔

دھوم کیتو: اچھا آیئے۔آج مکالمے کے ایک ٹکڑے کی ریہرسل کرلیں تا کہ سیٹ پر آسانی رہے۔پہلے میں آپ کو پڑھ کر سناؤں گا، اس کے بعد آپ اسے ادا کرنے کی کوشش کیجئے۔(فائیل سے مکالمے نکال کر پڑھتا ہے)

''دنیا بہت ظالم ہے پریم۔یہ دو دلوں کو ملنے نہیں دیتی۔جب پریمی ایک دوسرے سے پریم کرتے ہیں، تو دنیا کے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں۔ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں۔آنکھوں میں خون اتر آتا ہے''

(گھسیٹارام سے) اچھا اب آپ کہئے۔

گھسیٹارام: دنیا بڑی جالم ہے شوگار بیگم

دھوم کیتو: جالم نہیں۔ظالم

گھسیٹارام: جالم۔جالم

دھوم کیتو: ارے بھئی ظالم

گھسیٹارام: ہاں ہاں جالم ہی تو کہہ رہا ہوں۔

دھوم کیتو: عجیب آدمی ہو۔ظالم نہیں کہہ سکتے.....اچھا.....یہ لفظ بدل دیا جائے گا اور ہاں شوگار بیگم کا نام پریم کماری ہے جیسے تمہارا نام گھسیٹارام نہیں پریم کمار ہے اچھا اب باقی فقرے بولو۔

گھسیٹارام: یہ دو دلوں کو کبھی ملنے نہیں دیتی۔ جب پریمی ایک دوسرے سے پریم کرتے ہیں تو اس کے سانپوں پر سینے لوٹنے لگتے ہیں۔ ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں اور خون میں آنکھیں اتر جاتی ہیں۔

دھوم کیتو: (غصے سے) نان سنس (Nonsense) ایک دم نان سنس سب گڑ بڑ کر دیا۔ پھر کہو۔ سانپوں پر سینے نہیں۔ سینے پر سانپ۔ اور خون میں آنکھیں نہیں۔ آنکھوں میں خون۔ پھر کہو۔

گھسیٹارام: اچھا پی لو۔ (شنگار بیگم سے) شنگار بیگم۔ اپنے چہرے پر رنج و غم کے جذبات پیدا کرتے ہوئے کہئے۔ یہ سب قسمت کی بات ہے پریم ڈارلنگ میری قسمت میں یہی لکھا تھا کہ میں گھل گھل کر مر جاؤں''۔

شنگار بیگم: یہ سب پریم کی بات ہے قسمت ڈارلنگ

دھوم کیتو: پریم کی بات نہیں قسمت کی بات۔

شنگار بیگم: یہ سب قسمت کی بات ہے گھسیٹارام۔

دھوم کیتو: گھسیٹارام نہیں۔ پریم کمار۔

شنگار بیگم: یہ سب پریم کمار کی بات ہے قسمت ڈارلنگ

دھوم کیتو: نان سنس، ایک دم نان سنس، دیکھئے آپ کو یہ فقرے کہتے وقت مسکرانا نہیں چاہیے۔ یہ نہایت تریجک سین ہے۔ پھر کہئے۔

شنگار بیگم: یہ سب قسمت کی بات ہے پریم ڈارلنگ

دھوم کیتو: شاباش۔ بالکل ٹھیک۔ آگے کہئے۔

شنگار بیگم: آگے تو میں بھول گئی۔ کہوں کیا تمہارا سر؟

دھوم کیتو: نان سنس ڈائرکٹر کو اس طرح سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ معافی مانگئے

شنگار بیگم: اونہہ آئے بڑے ڈائرکٹر نہیں مانگتی۔

دھوم کیتو: معافی مانگنی پڑے گی۔ کہئے۔ ''مجھے بہت افسوس ہے''۔

شنگار بیگم: نہیں کہتی۔ اگر آپ مجبور کریں گے تو میں آپ سے روٹھ جاؤں گی اور ساری عمر نہیں بولوں گی۔

دھوم کیتو: میں کہتا ہوں شنگار بیگم ضد نہ کرو۔ معافی مانگ لو۔

شنگار بیگم: جایئے نہیں مانگتی۔

دھوم کیتو: اف۔ سارا کام چوپٹ ہو گیا۔ بتاؤ گھسیٹا رام۔ جلدی بتاؤ۔ اب میں کیا کروں؟ بڑی ضدی عورت ہے۔

گھسیٹا رام: میں بتاؤں آپ کیا کریں۔

دھوم کیتو: ہاں ہاں کوئی تدبیر بتاؤ۔ یہ تو ایک دم روٹھ گئی۔

گھسیٹا رام: آپ اس سے معافی مانگ لیجئے۔

دھوم کیتو: میں معافی مانگ لوں..... ہاں ہاں ٹھیک ہی تو ہے اچھا شنگار ڈارلنگ مجھے معاف کر دو۔

شنگار بیگم: (ہنس کر) اب آئے نہ سیدھی راہ پر۔ بڑا رعب جماتے تھے، ڈائرکٹر کہیں کے۔

دھوم کیتو: شکر ہے۔ شکر ہے تمہارا موڈ تو ٹھیک ہوا۔ اچھا رہر سل ختم باقی سیٹ پر کریں گے۔

ساتواں منظر

(سیٹھ دمڑی پرشاد کا کمرا)

(سیٹھ دمڑی پرشاد کچھ فلمی رسالے اور اخبارات پڑھ رہے ہیں۔ دھوم کیتو داخل ہوتا ہے)

دھوم کیتو: آداب عرض۔ سیٹھ صاحب۔

دمڑی پرشاد: اوہ۔ ڈائرکٹر صاحب۔ آداب عرض۔ آداب عرض۔ اتشریف رکھیے بھئی آپ نے تو کمال کر دیا۔ ''فلمی رسالے میں'' کلاؤناش عرف ستیاناس کا اشتہار، ہر اخبار میں اس کے چرچے۔

دھوم کیتو: آپ کی دعا ہے۔ سب ایڈیٹر اپنے دوست ہیں اور نہ بھی ہوں تو نقد نارائن کی برکت سے بنائے جا سکتے ہیں۔ ایک دفعہ تو ایسی پبلسٹی کی ہے کہ فلم ابھی ختم نہیں ہوئی اور پانچ ڈسٹری بیوٹرز کی آفرز میری جیب میں ہیں۔

دمڑی پرشاد: پانچ ڈسٹری بیوٹرز! پھر تو کام بن گیا۔

دھوم کیتو: دیکھئے سیٹھ صاحب۔ اس وقت تک پونے پانچ لاکھ خرچ آیا ہے۔ اور پونے بارہ لاکھ کی آفرز آ چکی ہیں۔

دمڑی پرشاد: پونے بارہ مت کہئے ڈائرکٹر صاحب یہ تو پو بارہ ہیں پو پارہ۔

دھوم کیتو: سب آپ کی دعا ہے۔ یہ تار ملاحظہ فرمایئے (تار دکھاتا ہے)

.....ناردرن سرکٹ کے لیے..... چار لاکھ

.....ایسٹرن سرکٹ کے لیے..... چار لاکھ

.....ویسٹرن سرکٹ کے لیے..... پونے چار لاکھ

ٹوٹل..... پونے بارہ لاکھ

دمڑی پرشاد: (خوشی سے) باپ رے پونے بارہ لاکھ یعنی پورے سات لاکھ کا منافع۔

دھوم کیتو: منھ میٹھا کرایئے سیٹھ صاحب۔ دیکھیے کتنی کامیاب پکچر بنائی ہے۔

دمڑی پرشاد: کرائیں گے۔ ضرور کرائیں گے۔ پہلے فلم تو ختم ہو لینے دیجئے۔ اچھا آخری شاٹ کب لے رہے ہیں!

دھوم کیتو: اس سوموار کو سیٹ پر ضرور تشریف لایئے گا۔

دمڑی پرشاد: ضرور۔ ضرور۔

دھوم کیتو: اچھا اب اجازت دیجئے۔ آداب عرض۔

آٹھواں منظر

(سیٹ پر ہیرو اور ہیروئن آمنے سامنے کھڑے ہیں اور سیٹھ صاحب کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ دھوم کیتو سین ڈائرکٹ کر رہا ہے)

دھوم کیتو: (گھنشیارام اور شنگار بیگم سے) یہ آخری شاٹ ہے۔ کافی زور دار ہونا چاہیے۔ چہرے پر ایسے جذبات ہونے چاہئیں جیسے کہ آپ دونوں کو کھویا ہوا خزانہ مل گیا ہے اور دراصل دو گانے کے بول بھی یہی ہیں۔ ہاں شنگار بیگم، ذرا گھنشیارام کی طرف مسکرا کر دیکھئے اور دوگانا شروع کیجئے۔

شنگار بیگم: مل گیا جی۔ مجھے مل گیا جی۔ مجھے مل گیا جی!
میرا کھویا ہوا خزانہ

گھنشیارام: مل گیا رے مجھے مل گیا رے مجھے مل گیا رے

میرا کھویا ہوا خزانہ

شنگار بیگم: آج میرے من کی کوئل کوک اٹھی رے

گھسیٹا رام: آج مجھے بائے بڑی بھوک لگی رے

شنگار بیگم: آج میری آنکھوں میں خمار سا ہے کیوں

گھسیٹا رام: آج مجھے چڑھ رہا بخار سا ہے کیوں

شنگار بیگم، گھسیٹا رام: مل گیا رے، مجھے مل گیا رے، مجھے مل گیا رے

میرا کھویا ہوا جی خزانہ

دھوم کیتو: کٹ (Cut) شاٹ ختم

نواں منظر

(سیٹھ دمڑی پرشاد کا دفتر)

(دھوم کیتو۔ گھسیٹا رام۔ شنگار بیگم اور باقی ایکٹر جنہوں نے کلاؤناش عرف ستیاناس میں کام کیا۔ سیٹھ دمڑی پرشاد کے دائیں بائیں بیٹھے ہیں)

دمڑی پرشاد: لیڈیز اینڈ جنٹل مین! یہ چھوٹا سا جلسہ میں نے اس لیے منعقد کیا ہے کہ آپ سب لوگوں کو مبارکباد پیش کی جائے۔ آپ لوگوں کو یہ سن کر بہت خوشی ہوگی کہ:

''کلاؤناش عرف ستیاناس''

نے ہر جگہ کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کیے ہیں۔

''.....بمبئی میں.....چالیس ہفتے۔

''.....دہلی میں.....تیس ہفتے۔

''.....آگرہ میں.....بیس ہفتے۔

''.....جالندھر میں.....پچیس ہفتے.....اور

''.....ناگپور میں.....بتیس ہفتے۔

سب ایکٹر: (تالیاں پیٹتے ہوئے) مبارک۔ مبارک۔ مبارک

دمڑی پرشاد: میں اس مبارک موقعہ پر کچھ انعامات تقسیم کرنا چاہتا ہوں۔

سب ایکٹر: ارشاد۔ارشاد۔ارشاد!

دمڑی پرشاد: شدگار بیگم کو یہ انعام دیا جاتا ہے کہ آج دو پہر کو میں اس سے شادی کرلوں گا۔ بشرطیکہ ڈائرکٹر صاحب کو کوئی عذر نہ ہو۔

دھوم کیتو: مجھے بالکل کوئی عذر نہیں ہے۔

دمڑی پرشاد: شکریہ۔ ڈائرکٹر صاحب کو فلم ڈائرکٹ کرنے اور رشدگار بیگم کو معاف کرنے میں فراخ دلی دکھانے کے لیے ایک سیکنڈ ہینڈ بائیسکل پیش کی جائے گی۔اس کے ساتھ ہی میری اگلی فلم "سروناش عرف بکواس" کو بھی وہی ڈائرکٹ کریں گے۔

دھوم کیتو: شکریہ۔ بہت بہت شکریہ۔

دمڑی پرشاد: گھسیٹا رام کی خدمات کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ انہیں ایک ریشمی بش شرٹ سلوادی جائے اور باقی ایکٹروں کی خدمت میں کان پوری چپل کا ایک ایک جوڑا پیش کیا جائے۔

سب ایکٹر: شکریہ۔ بہت بہت شکریہ

دمڑی پرشاد: جلسہ ختم ہونے سے پہلے سب لوگ مل کر تین دفعہ نعرہ لگائیے..........کلاوناش!

سب ایکٹر: زندہ بار

دمڑی پرشاد: ستیاناس

دمڑی پرشاد: سیٹھ دمڑی پرشاد!

سب ایکٹر: زندہ باد (پردہ)

☆☆☆

دانت نکلوانا

شیکسپیئر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ شاکر سے شاکر انسان بھی دانت کا درد برداشت نہیں کر سکتا۔ اس فقرے کی صداقت کو صرف وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جن کو شیکسپیئر یا میری طرح دانت کا درد ہوا ہو۔ ورنہ عام انسان تو اس فقرے کو پڑھ کر بے اختیار مسکرا دیتا ہے اور کہتا ہے۔ یہ شیکسپیئر بھی کتنا سادہ لوح آدمی تھا۔ اگر دانت کے درد کی بجائے قولنج کا درد، یا جگر کا درد لکھ دیتا تو شاید میں مان جاتا۔ مگر دانت کا درد!...... حتیٰ کہ کسی دن اس کو اچانک رات کے گیارہ بجے دانت

کا درد آ دباتا ہے۔ پہلے پہلے وہ شاکر بننے اور شیکسپیئر کو جھٹلانے کی ناکام کوشش کرتا ہے اور دل کو یوں تسلی دیتا ہے کہ آخر غالب مرحوم نے بھی تو فرمایا ہے کہ ع

''درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا''

پھر خوامخواہ پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر جب دو دن کے بعد یہ درد اسے رات کو مطلقاً سونے نہیں دیتا۔ اور اس کی وجہ سے وہ گھر میں کسی اور کو مطلقاً سونے نہیں دیتا تو اسے شیکسپیئر کی بات کا کچھ یقین ہونے لگتا ہے اور تیسرے دن علی الصباح وہ اپنے آپ کو کسی دندان ساز کے ویٹنگ روم میں بیٹھا ہوا پاتا ہے۔

بعینہٖ یہی حال پچھلے ہفتہ میرا ہوا۔ ویسے تو میں تقریباً ہر درد سے آشنا ہوں مگر یہ معلوم نہ تھا کہ دانت کے درد میں وہ تڑپ پوشیدہ ہے کہ درِ دل، درِ گردہ، درِ جگر تو اس کے مقابلہ میں ''عین راحت'' ہیں۔ چنانچہ جب متواتر تین رات کراہنے اور ہر ہمسائے کے تجربے سے فائدہ اٹھانے کے بعد بھی درد میں کچھ افاقہ نہ ہوا تو میں نے ڈاکٹر اندر کمار کی دکان کا رخ کیا۔ آپ دانتوں کی بیماریوں کے ماہر ہیں اور دانت بجلی سے نکلتے ہیں۔ شاید موخر الذکر چیز نے مجھے ان کی جانب رجوع کرنے کو اکسایا کیونکہ بجلی کے سوا شاید ہی کوئی دوسری چیز مجھے بچا سکتی۔ چنانچہ میں نے ان کی دوکان میں لیکتے ہوئے کہا!

''میری بائیں ڈاڑھ فوراً بجلی سے نکلا دیجئے''

ڈاکٹر صاحب نے حیرت سے میری طرف تکتے ہوئے کہا۔ ''آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟'' ''آپ مجھ سے راہ و رسم بعد میں بڑھا سکتے ہیں۔ پہلے میری بائیں ڈاڑھ نکالیے''۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا تشریف رکھیے، ''گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ابھی نکالے دیتا ہوں''۔ اس کے بعد آپ نے مجھ پر سوالات کی بمباری شروع کر دی۔ ''مثلاً کب سے درد ہے؟'' کیوں درد ہے؟ اوپر والی ڈاڑھ میں ہے یا نیچے والی داڑھ میں؟ اس سے پہلے بھی کبھی دانت نکلوایا ہے! کیا صرف ایک ہی دانت نکلوانا چاہتے ہیں؟''۔

اب میں تھا کہ درد سے بیتاب ہو رہا تھا اور ہر سوال کا جواب دینے کی مجھ میں ہمت نہ تھی، مگر ڈاکٹر صاحب تھے کہ برابر مسکرائے جا رہے تھے۔ اور جب میں درد سے کراہتا تو ان کی مسکراہٹ زیادہ دل آویز اور دل کش ہو جاتی۔ آخر جب انہوں نے دو تین دفعہ میرے منع

کرنے کے باوجود اچھی طرح ڈاڑھ کو ہلایا اور دیکھا کہ شدتِ درد سے مجھ پر بے ہوشی طاری ہوا چاہتی ہے تو انہیں یقین ہو گیا کہ واقعی دانت کا درد ہے۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود دو تین اوزار گرم پانی میں ابالنے لگے۔ میں نے کہا۔ ''اجی حضرت جلدی کیجئے۔ بجلی سے میری ڈاڑھ نکالیے''۔ کہنے لگے'' آج بجلی خراب ہو گئی ہے اس لیے ڈاڑھ ہاتھ سے ہی نکالنا پڑے گی''۔

جتنا عرصہ اوزار گرم ہوتے رہے وہ مجھے دانت کی خرابیوں سے پیدا ہونے والی بیماریوں پر لیکچر دیتے رہے۔ ان کے خیال کے مطابق دنیا کی تمام بیماریاں دانتوں ہی کے خراب ہو جانے سے پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ بدہضمی سے تپ دق تک جتنے امراض ہیں، ان کا علاج ڈاڑھ نکلوانا ہے۔ اس لیکچر میں آپ نے اس ملک کے لوگوں کی عادات پر بھی کچھ تبصرہ کیا۔ مثلاً، یہاں کے لوگ بے حد بے پرواواقعہ ہوئے ہیں۔ امریکہ اور انگلینڈ میں ہر ایک آدمی سال میں چار دفعہ دانت صاف کرواتا ہے۔ مگر یہاں لوگ اس وقت تک دندان ساز کی دکان کا رخ نہیں کرتے جب تک دانت کو کیڑا لگ کر سارا مسوڑھا تباہ نہ ہو جائے، افسوس تو اس بات کا ہے کہ آپ جیسے پڑھے لکھے آدمی بھی دانتوں کی ذرا پروا نہیں کرتے، اگر لوگ ذرا محتاط ہوں تو آج ان کی مشکلیں حل ہو جائیں۔

اس قسم کی متعدد جملے وہ ایک ہی سانس میں کہہ گئے، حتیٰ کہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ ہمارے ملک کے سچے خیر خواہ صرف آپ ہیں اور اگر آپ نہ ہوتے تو خدا جانے ہمارے ملک کی کیا حالت ہوتی۔

جب اوزار گرم ہو چکے تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ ''اب انجکشن ہوگا'' انجکشن کے نام سے مجھے روزِ اول ہی سے چڑ ہے کیونکہ میرے خیال میں انجکشن مہذب طریقے سے ایذا پہنچانے کا دوسرا نام ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے یقین دلایا کہ انجکشن سے کسی قسم کا درد نہیں ہوگا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ کسی قدر مبالغہ آمیزی سے کام لے رہے تھے۔ کیونکہ انجکشن سے کافی درد ہوا۔ انجکشن کرنے کے دو تین منٹ بعد انہوں نے زنبور پکڑا اور اب مجھے وہ انسان کی بجائے موت کا فرشتہ نظر آنے لگے۔ دل میں آیا کہ ہمت کر کے بھاگ نکلوں۔ میں اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ انہوں نے ذرا نرمی سے کہا۔ ''میں آپ کو بارہویں دفعہ پھر یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو مطلقاً درد نہیں ہوگا،

میں نے دبی زبان سے کہا۔ ''میں آپ کو بارہویں دفعہ یقین دلاتا ہوں کہ مجھے آپ کی بات کا یقین نہیں''۔ مگر انہوں نے معاملے کو طول نہ دیتے ہوئے مجھے منہ کھولنے کو کہا۔ وہ ڈاڑھ کو زنبور کی گرفت میں لائے اور مجھے محسوس ہوا کہ اب وصیت کرنے اور احباب اور اقربا کو آخری تلقین کرنے کا وقت آ پہنچا ہے۔ انہوں نے زنبور کو جھٹکا دیا اور درد حد سے گزر کر ''قضا'' معلوم ہونے لگا۔ انہوں نے دوسرا جھٹکا دیا اور میں سمجھا کہ اب انہوں نے مجھے ضرور جان سے مارنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس کے بعد دانت اور زنبور میں ایک باقاعدہ کشتی شروع ہوئی۔ ڈاڑھ اپنی جگہ پر اس طرح قائم تھی جس طرح قطب منار ہزاروں زلزلوں کے باوجود اب تک اپنی جگہ پر جما ہوا ہے۔ مگر اس کھینچا تانی میں میں مفت میں ذبح ہو رہا تھا۔ یہ کشمکش یا کشتی کافی عرصہ تک جاری رہی اور آخر زنبور اور دانت میں یہ تصفیہ ہوا کہ آدھی ڈاڑھ زنبور کے منہ میں اور آدھی میرے منہ میں رہے۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت پسینہ پسینہ ہو رہے تھے، ان کی گھبراہٹ دیکھ کر قریب تھا کہ میں بھی ہوش و حواس کھو بیٹھوں کہ انہوں نے بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا۔ ''توبہ کتنی گہرائی میں ہے یہ ڈاڑھ بہت، کوشش کی کہ نہ ٹوٹے مگر ٹوٹ ہی گئی''۔

درد سے کراہتے ہوئے میں نے کہا۔ ''اب کیا ہوگا؟''

''گھبرانے کی ضرورت نہیں''۔

اس کے بعد انہوں نے جس طرح میری باقی کی آدھی ڈاڑھ نکالی یہ صرف وہی لوگ جان سکتے ہیں جنہیں دانت ٹوٹنے کا سانحہ کبھی پیش آیا ہو۔ بس صرف یہ سمجھ لیجئے کہ میری وہی حالت تھی جو آپ کی ہو۔ اگر میں آپ کے بدن میں متعدد جگہوں سے لمبی لمبی سوئیاں چبھوتا جاؤں اور ساتھ ساتھ آپ کو تسلی دیتا رہوں کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تقریباً آدھ گھنٹے کی پیہم کوشش کے بعد ڈاکٹر صاحب باقی ڈاڑھ نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔

اس عرصے میں مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کئی بار اگلے جہان پہنچا ہوں اور کتنی بار وہاں سے لوٹا ہوں۔ اور پھر آخر کار میں نے اپنے آپ کو نیم کسل کی ہی حالت میں ڈاکٹر صاحب کی کرسی پر بیٹھا ہوا پایا۔ جب کچھ ہوش سنبھالا تو ایسا معلوم ہوا کہ منہ سے بے تحاشا خون بہہ رہا ہے اور ڈاکٹر صاحب ایک گلاس لے کر جس میں خون سے ملتی جلتی رنگت والی کوئی دوا گھلی ہوئی ہے، کرسی کے نزدیک کھڑے ہیں۔ اس کے بعد چند ثانئے نہایت عذاب کی حالت میں گزرے۔ ڈاکٹر

صاحب غرارے کرنے کو کہہ رہے تھے، اور میں انہیں، ایمبولنس کار کے لیے فون کرنے کو عرض کر رہا تھا اور ساتھ ہی سوچ رہا تھا کہ نزدیک کے پولیس اسٹیشن میں جا کر اس سانحہ کی رپورٹ درج کراؤں تو شاید ضرورت کے وقت کام آئے۔ بارے کہیں پندرہ منٹ کے بعد خون بہنا بند ہوا۔ کچھ ڈھارس بندھی مگر اب سخت درد ہونا شروع ہوا اور میں نے بہتری اسی میں سمجھی کہ ڈاکٹر صاحب کی دکان میں بے گور و کفن مرنے کی نسبت گھر لوٹ چلوں۔ تانگہ میں بیٹھ کر بڑی مشکل سے گھر پہنچا اور ایک گھنٹہ تک اوندھے منہ بستر میں لیٹا کراہتا رہا۔ اس کے بعد جوں جوں درد کم ہوتا گیا، گال سوجتا گیا، حتیٰ کہ دو تین گھنٹے کے بعد مجھے ایسا معلوم ہونے لگا گویا میرے جسم پر کسی اور شخص کا چہرہ لگا ہوا ہے۔ اس وقت میں سمجھا کہ کیوں میرے ہم وطن دندان ساز کی دکان کا آسانی سے رخ نہیں کرتے۔

☆☆☆

دیوانہ گر نہیں ہے تو.....

یک لخت وہ محفل میں وارد ہوئے اور سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ جو ذرا زیادہ کم ہمت تھے دل ہی دل میں جل تو جلال تو کا وظیفہ پڑھنے لگے۔ وجہ یہ کہ نو وارد تغلق خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے ہمیشہ یہ ڈر رہتا ہے کہ خدا جانے وہ کسی وقت کس سے کیا کہہ دیں۔ کرسی پر دراز ہونے کے بعد انہوں نے اہلِ محفل کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور فرمایا:

''یہ آج کلب میں غیر معمولی سناٹا کیوں ہے۔ کوئی بات کیجئے''۔ کسی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''تھک گئے ہیں''۔

''واہ۔ تھکاوٹ کی بھی ایک ہی کہی۔ تھک گئے ہیں تو شیش آسن کیجئے۔ تھکاوٹ دور کرنے کا بہترین طریقہ ہے''۔

اور وہ سر کے بل کھڑے ہو کر شیش آسن کا مظاہرہ کرنے لگے۔ جب جی بھر کر مظاہرہ کر چکے تو کہا۔

''تندرستی کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں۔ شیش آسن اور ایسب غول''۔

کلب کے کسی ممبر نے محض چھیڑنے کے لیے کہا۔ ''اس دن تو آپ فرما رہے تھے کہ صحت کو

برقرار رکھنے کے لیے ہر روز آنولہ کھانا چاہیے''۔

''آنولہ بھی اچھی چیز ہے لیکن ایسب غول کا مقابلہ نہیں کر سکتا''۔

''دودھ کے متعلق کیا ارشاد ہے؟''۔

''دودھ کو تو میں زہر سمجھتا ہوں۔ دودھ اسی فیصد بیماریوں کا ذمہ دار ہے چاہے وہ ماں کا ہو یا بکری کا''۔

''بھینس کے دودھ سے بدتر شاید ہی کوئی چیز ہوگی۔ بھینس کا دودھ پینے والے کی عقل بھینس سے بھی موٹی ہو جاتی ہے۔ اس کی بجائے لیموں کا رس پینا چاہیے۔ اس میں وٹامن سی ہوتا ہے''۔

''سنا ہے وٹامن سی تو گھاس میں بھی ہوتا ہے''۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ لیکن سبز گھاس میں، خشک میں نہیں، خشک گھاس میں البتہ وٹامن ڈی ہوتا ہے''۔

''آپ سبز گھاس کھاتے ہیں یا خشک؟''

اس پر ایک زوردار قہقہہ لگا اور مجلس برخاست ہوگئی۔

کلب سے اٹھ کر گھر آئے۔ ابھی اخبار پڑھنے کے لیے اٹھایا ہی تھا کہ ایک اور صاحب تشریف لائے۔

''برا نا مانیئے گا'' انہوں نے بڑی نرمی سے کہا۔ ''میں آپ کے پاس ایک شکایت لے کر آیا ہوں''۔

''کہیئے''۔

''آپ کے بچے بہت شور مچاتے ہیں۔ میں مطالعہ نہیں کر سکتا۔ مطالعہ کے بغیر ریسرچ نہیں ہو سکتی اور ریسرچ کے بغیر پی۔ ایچ۔ ڈی۔ نہیں ہو سکتی''۔

''میں بچوں سے کہہ دوں گا کہ وہ شور نہ مچایا کریں''۔

''نہیں، نہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں۔ شور وہ بیشک مچایا کریں لیکن جس وقت میں غسل خانے میں ہوتا ہوں، اس وقت خاموش رہا کریں۔ بات یہ ہے کہ میں سوچنے کا کام غسل خانے میں کرتا ہوں۔ کچھ لوگ غسل خانے میں گانے لگتے ہیں۔ یہ اول درجے کی بدمذاقی ہے، یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی ٹرام میں ناچنے لگے''۔

''آپ ریسرچ کس موضوع پر کر رہے ہیں؟''۔

''قطب منار پر۔ میرا خیال ہے کہ قطب مینار کی گیارہ منزلیں تھیں سات نہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ چار منزلیں کہاں گئیں''۔

''غالباً وہ کوئی بیرونی حملہ آور اپنے ساتھ لے گیا''۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ لیکن سوال پھر پیدا ہوتا ہے کہ وہ حملہ آور کون تھا؟ ہندوستان میں کب آیا؟ اور وہ صرف چار منزلیں اپنے ساتھ کیوں لے گیا؟ یعنی اس نے سالم قطب منار کو اڑانا کیوں مناسب نہ سمجھا؟''۔

''ممکن ہے وہ کسی حادثے کا شکار ہو گئی ہوں''۔

''ہو سکتا ہے۔ لیکن اب سوال تیسری بار پیدا ہوتا ہے کہ کون سے حادثے کی۔ بھونچال، سیلاب۔ ٹڈی دل۔ میرا مطلب ہے حادثے بھی تو کئی ہو سکتے ہیں''۔

''بہر حال موضوع دلچسپ ہے، ریسرچ جاری رکھئے''۔

''ریسرچ تو جاری رکھوں گا ہی۔ لیکن آپ ذرا بچوں سے کہہ دیجئے کہ جب میں غسل''..... ''ہاں ہاں۔ وہ میں کہہ دوں گا''۔

صبح دفتر گئے، ابھی بیٹھے ہی تھے کہ چپراسی نے اطلاع دی کہ بڑے صاحب یاد فرما رہے ہیں۔ بڑے صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے اشارے سے کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔

''مسٹر۔ انہوں نے فرمایا'' میں نے آپ کو ایک نہایت ضروری کام سے بلایا ہے۔''

''ارشاد؟''

''وہ ضروری کام یہ ہے..... یہ تھا..... کہ..... ہاں..... وہ کہ..... کیا تھا وہ ضروری کام..... اچھا آپ جا سکتے ہیں''۔

پندرہ بیس منٹ کے بعد انہوں نے پھر بلا بھیجا۔ ''ہاں مسٹر وہ ضروری کام یاد آ گیا، کل ہفتے کا کون سا دن تھا؟''

''جی اتوار''۔

''اچھا آپ جا سکتے ہیں''۔

آدھ پون گھنٹے کے بعد انہوں نے پھر یاد فرمایا۔ ''مسٹر! مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ آفس میں سگریٹ پیتے ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟''

''جی ہاں''

''دیکھئے آفس میں سگریٹ مت پیا کیجئے، اگر کسی فائل کو آگ لگ گئی تو کون ذمہ دار ہوگا''۔

''آئندہ نہیں پیا کروں گا''۔

''اور ہاں۔ یہ سرخ رنگ کی ٹائی پہن کر مت آیا کیجئے۔ مجھے سرخ رنگ سے سخت نفرت ہے۔''

''بہت اچھا جناب''۔

''یہ آج آپ کی آنکھیں لال کیوں ہو رہی ہیں''۔

''غالباً اس لیے کہ رات گئے تک دفتر کا کام کرتا رہا''۔

''نہیں یہ وجہ نہیں ہو سکتی۔ آپ کا جگر خراب ہے۔ آپ گرم پانی کا گلاس روزانہ پیتے ہیں''۔

''گرم پانی تو نہیں البتہ چائے دو تین بار پیتا ہوں''۔

''چائے جگر کی نمبر ون دشمن ہے۔ چائے بالکل ترک کر دیجئے۔ گرم پانی کے گلاس پیا کیجئے''۔

''بہت اچھا جناب''

تین بجے کے قریب انہوں نے پھر بلا بھیجا۔ ''مسٹر! ابھی ابھی اطلاع آئی ہے کہ انسپکٹر صاحب کل یہاں تشریف لا رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے اعزاز میں ایک پارٹی کی جائے اور آپ اور دفتر کے باقی ملازم پارٹی پر ایک قوالی گائیں''۔

''لیکن بندہ پرور! قوالی ہم کیسے گائیں گے۔ میرا مطلب ہے کہ ہم میں سے کوئی''۔

''گانا نہیں جانتا۔ یہی مطلب ہے نا آپ کا''۔

''جی ہاں''۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ سیکھ سکتے ہیں''۔

''لیکن جناب ہم نے آج تک قوالی.....؟''

''میں کوئی عذر سننے کے لیے تیار نہیں۔ قوالی آپ کو گانا ہوگی۔ یہ میرا حکم ہے۔ آپ ابھی سے اس کی تیاری کیجئے''۔

''لیکن جناب دیکھئے نا۔ ہم قوالی.....''۔

''بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ حکم کی تعمیل ہونی چاہیے''۔

اپنا سامنہ لے کر دفتر سے باہر چلے آئے۔ تھکے ماندے گھر پہنچے۔ گراموفون پر کلن قوال کی گائی مشہور قوالی کا ریکارڈ لگایا اور بیوی بچوں کے ساتھ تالیاں بجا بجا کر گانے لگے۔

دیکھا ہے ہم نے جلوت و خلوت میں اسد کو
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

☆☆☆

ہندوستان دیکھئے

میں ابھی ابھی ایک گاڑی سے اترا ہوں اور تھرڈ کلاس کے مسافر خانے میں ایک بینچ پر بیٹھ کر دوسری گاڑی کا انتظار کر رہا ہوں۔ میں ایک رشتہ دار کی شادی میں شامل ہونے کے لیے گیا تھا اور مجھے افسوس ہو رہا ہے۔ اس لیے نہیں کہ شادی اس کی تھی اور کوفت مجھے ہوئی بلکہ اس لیے کہ ایک سترہ سالہ حسین دوشیزہ ایک بدصورت ادھیڑ عمر کے آدمی کے پلے باندھی گئی۔ مجھے اس راز کا پتا بعد میں چلا ورنہ میں ہرگز اس شادی میں شامل نہ ہوتا۔ یہ میرا رشتہ دار بریلی میں وکیل ہے۔ تقسیم ہند کے بعد ایک خاندان نے اس کے قرب میں پناہ لی۔ وہ اس خاندان پر ڈورے ڈالنے لگا۔ اپنے رسوخ سے انہیں ایک ٹوٹا بھوٹا مکان الاٹ کرا دیا۔ اپنا بوسیدہ فرنیچر ان کے گھر بھجوا دیا۔ بڑے لڑکے کو مقامی بینک میں چپڑاسی لگوا دیا۔ پچھلے سال اس کی بیوی سرگباش ہو گئی اور اس سال اس فرشتہ سیرت وکیل نے اس شرنارتھی خاندان کی دوشیزہ سے جو ایف، اے پاس ہے، شادی رچالی۔ میں نے اس لڑکی کی ایک ہلکی سی جھلک اس وقت دیکھی تھی جب وہ ڈولی میں سوار ہو رہی تھی۔ بھرا بھرا جسم، گورا چٹا رنگ اور آنکھیں! ایسی آنکھیں جنہیں ایک بار دیکھنے کے بعد پھر کوئی دوسری چیز نظروں میں نہیں جچتی۔ نہ جانے اسے دیکھ کر مجھے ایک شاعر کا مصرع کیوں یاد آ گیا تھا۔

ع ''بھگوان نے جب اس لڑکی کو بنایا ہوگا تو اس کا اپنا ایمان متزلزل ہونے سے کیسے بچا ہوگا؟''

اور بنچ پر بیٹھا ہوا میں سوچ رہا ہوں کہ اس لڑکی کی کس کس حسرت کا خون ہوا ہوگا۔ میرے سامنے مسافر خانے کی ٹین کی دیوار پر بڑے بڑے اشتہار لگے ہوئے ہیں۔ کسی پر کشمیر کا منظر ہے، کسی پر بمبئی، کلکتے کی چورنگی تصویر ہے۔ اجنتا اور ایلورا کی غاریں ہیں۔ ان اشتہاروں کے

نیچے موٹے حروف میں لکھا ہے ''سی انڈیا'' (ہندوستان دیکھئے)

میں یہ پڑھ کر دل میں کہتا ہوں۔

''خوب۔ ہندوستان دیکھئے۔ تو گویا ابھی تک ہم انگلستان یا فرانس دیکھتے رہے ہیں''۔

ہندوستان دیکھئے! لیکن کیوں نہ اس سے پہلے ہندوستان کا محکمہ ریل دیکھئے۔ سبحان اللہ کیا نئی نئی گاڑیاں ایجاد کی ہیں اس محکمے نے۔ جتنا ایکسپریس! اگر اس کا نام ''جہنم ایکسپریس'' رکھ دیتے تو کیا ہرج تھا۔ میں ابھی ابھی اسی گاڑی کا سفر کر کے آرہا ہوں۔ ہر تھرڈ کلاس ڈبا کلکتے کے رعایتی ''بلیک ہول'' کی یاد دلاتا تھا۔ خدا جانے کلکتے میں کوئی واقعی بلیک ہول تھا یا یہ کسی انگریز کے زرخیز دماغ کی اختراع تھی۔ مگر یہاں تو ایک نہیں درجنوں بلیک ہول دیکھ لیجئے، پچاس پچاس آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ اور سوار ہیں ایک سو پچاس۔ کچھ کھڑے ہیں، کچھ فرش پر لیٹے ہوئے ہیں اور باقی باہر لٹک رہے ہیں۔

ہمیں تو اس کے کوچے میں کسی صورت بسر کرنا
کھڑے ہیں یا پڑے ہیں یا پس دیوار بیٹھے ہیں

اور پھر ہر نئے اسٹیشن پر نئے مسافروں کی یلغار، نشستوں کا یہ حال کہ اگر نشست پر بیٹھنے کی کوشش کی جائے تو آسانی سے آدمی کسی دائیں بائیں بیٹھے ہوئے مسافر کی گود میں جا گرے۔ کرایہ کمر توڑ! یعنی تھرڈ کلاس کا کرایہ ادا کیجئے تو محسوس ہو کہ سیکنڈ کلاس کے دام لیے جا رہے ہیں، اور تھرڈ کلاس میں بیٹھئے تو پتا چلے کہ فورتھ یا ففتھ کلاس میں سفر کر رہے ہیں۔

خوب! ہندوستان دیکھئے۔ لیکن ریلوے ورکشاپ میں کام کرنے والے مزدوروں کی حالت مت دیکھئے کیونکہ وہ دیکھنے کے لائق ہی کب ہے؟ اس لیے آپ مزے سے اجنتا ایلورا کی سیر کیجئے۔

میرے بنچ کے قریب ایک نیم برہنہ نوجوان فرش پر لیٹا ہوا ہے۔ ہر پندرہ بیس منٹ کے وقفے کے بعد وہ دھاڑیں مار مار کر روتا ہے اور ظفر کی مشہور غزل کا مقطع پرسوز لے میں دہراتا ہے۔

کوئی مجھ پہ شمع جلائے کیوں، کوئی مجھ پہ آنسو بہائے کیوں
کوئی مجھ پہ پھول چڑھائے کیوں، کہ میں بے کسی کا مزار ہوں

یا الٰہی اس شخص کو کیا ہوا ہے؟ میں وقت کاٹنے کے لیے بنچ پر اونگھتے ہوئے اپنے ساتھی سے

پوچھتا ہوں۔ وہ کہتا ہے کچھ معلوم نہیں۔ اس کے متعلق عجیب وغریب روایتیں ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ اسے ایک برہمن لڑکی سے عشق تھا۔ وہ بھی اسے چاہتی تھی۔ لیکن لڑکی کے ماں باپ رضا مند نہ ہوئے کیونکہ یہ کھتری ہے اور وہ برہمن۔ یہ بھی سنا ہے کہ اسے کسی لڑکی سے عشق نہیں تھا۔ اس نے ایک بار سائیں کو پیسہ نہیں دیا تھا۔ اس نے بد دعا دی کہ تو پاگل ہو جائے گا اور کتے کی موت مرے گا۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ یہ شخص بڑا ذہین ہے۔ ایم اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا ہے۔ چار سال نوکری کے لیے مارا مارا پھرتا رہا۔ کہیں کام نہ بنا۔ فاقوں کے مارے برا حال ہو گیا اور ایک دن دماغ چل گیا۔ کسی نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ کسی کارخانے میں مزدور تھا۔ پچھلے دنوں چھانٹی میں آ گیا اور متواتر بیکار رہنے کی وجہ سے دماغ خراب ہو گیا۔ کل ایک شخص کہتا تھا کہ یہ بے چارا شرنارتھی ہے۔ چار پانچ سال سرکار کے وعدوں پر جیتا رہا اور اب اس حال کو جا پہنچا ہے۔

میرا ساتھی بات ختم کر کے پھر اونگھنے لگا ہے۔ اس نوجوان نے پھر ایک دلدوز چیخ بلند کی ہے اور زور زور سے کہہ رہا ہے کہ وہ بے کسی مزار ہے۔ بے کسی کا! میری نظریں پھر سامنے والے اشتہار پر جا پڑیں۔ ''کشمیر دیکھیے! نشاط باغ کی سیر کیجئے'' آہ کشمیر! کشمیر کا نام پڑھتے ہی نہ جانے میری یہ حالت کیوں ہو جاتی ہے کہ بے اختیار فراق کا مصرع میرے نطق پر آ جاتا ہے۔

ع اک تیز چھری ہے کہ اترتی چلی جائے

دو سال ہوئے میں کشمیر گیا تھا۔ نشاط باغ بھی دیکھا۔ لیکن افسوس مجھے ایک عام کشمیری کی زندگی نشاط سے خالی نظر آئی، جیسے اسے ہمیشہ کے لیے نشاط باغ سے نکال دیا گیا ہو۔ جس طرح آدم وحوا کو باغِ بہشت سے نکال دیا گیا تھا مگر انہوں نے تو گناہ کیا تھا۔ کشمیریوں نے کون سا گناہ کیا ہے۔ نشاط باغ کی تصویر دیکھتے ہوئے ذہن کے پردے پر ہزاروں بھوکے ننگے غلیظ کشمیری ابھر آتے ہیں جو ہاتھ پھیلا پھیلا کر پکار رہے ہیں۔ بخشیش بخشیش۔ یا خدا میں ان سب کو کہاں سے بخشیش دوں۔ میں گھبرا کر اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتا ہوں۔

''جہلم میں کھڑے ہوئے ہاؤس بوٹ دیکھیے''۔

ضرور دیکھیے۔ لیکن ڈونگوں میں بیٹھی ہوئی غریب کشمیری عورتیں بھی دیکھیے نا۔ میں ایک بار شکارے میں سوار ہو کر ان کے قریب سے گزرا تھا۔ اف! چاندی عورتیں اور غلیظ ترین فرغلوں

میں ملبوس۔ ایسے فرغل جنہیں شاید صدیوں میں ایک بار دھویا جاتا ہے۔ وجہ؟ صاحب خرید نے کے لیے پیسے نہیں۔ ان میں سے اکثر ڈونگوں کے تنگ و تاریک چوبی کمروں میں پیدا ہوتی ہیں، ڈونگوں میں پروان چڑھتی ہیں اور محنت مزدوری کرتے کرتے ڈونگوں میں ہی مر جاتی ہیں۔ سنا ہے ان میں کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی شادی نہیں ہو سکتی کیونکہ والدین بوڑھے ہیں۔ اگر شادی ہو گئی تو انہیں مزدوری کر کے کون کھلائے گا؟

شادی! اور مجھے اس ادھیڑ عمر کے رشتہ دار پر رہ رہ کر غصہ آ رہا ہے جس نے پینتالیس برس کی عمر میں ایک سترہ سالہ لڑکی سے دوسری شادی رچالی اور فخر سے اپنے دوستوں سے کہتا پھرتا ہے۔

''وہ دھوانہیں صاحب دوشیزہ ہے۔ ایک دم دوشیزہ، شکل سے سولہ سترہ برس کی ہو گی۔ لیکن صاحب مفت ہاتھ نہیں آئی۔ شادی کے سب اخراجات میں نے ادا کیے۔ اس کے علاوہ اس کے والدین کو نقد پانچ سو روپے بھی دیئے۔ بے چارے شرنارتھی ہیں۔ سودا لیکن مہنگا نہیں رہا''۔

فرش پر لیٹے ہوئے نوجوان نے پھر فلک شگاف نعرہ بلند کیا۔

''کوئی مجھ پہ آنسو بہائے کیوں؟''

''ٹھیک کہتے ہو استاد''۔ میں اس سے کہتا ہوں۔ ڈولی میں بیٹھی ہوئی حسین دوشیزہ نے بھی یہی کہا تھا۔

''تم ہی صرف بے کسی کے مزار نہیں ہو۔ اس ہندوستان میں ہزاروں ایسے مزار موجود ہیں۔

''بمبئی دیکھئے۔ میرین ڈرائیو کی سیر کیجئے''

ضرور سیر کریں گے۔ لیکن پہلے فٹ پاتھوں پر لیٹی ہوئی مخلوق کے نظارے سے تو فارغ ہو لیں۔ میرین ڈرائیو کہیں بھاگی نہیں جاتی۔ ان لوگوں کا نظارہ کیوں نہ کریں جو مون سون کے موسم میں ساری ساری رات پڑے بھیگتے رہتے ہیں اور پانی ہے کہ برسے ہی چلا جاتا ہے، اور بمبئی میں ہزاروں خدا کے گھر ہیں۔ گرجے، مندر، مسجدیں جو رات کو خالی پڑے رہتے ہیں لیکن جہاں خدا کے بندوں کو جانے کی اجازت نہیں۔ کیونکہ خدا بہت بڑا ہے اسے سونے کے لیے بہت جگہ چاہیے۔

''راجستھان دیکھئے''

اس تصویر میں شادی کا منظر دکھایا گیا ہے۔ دولہا گھوڑے پر سوار ہے۔ اس کے پیچھے کہار ڈولی اٹھائے آ رہے ہیں۔ باراتی رنگ برنگے لباسوں میں ملبوس پیچھے پیچھے چل رہے ہیں۔ کتنا دلفریب منظر ہے۔ لیکن اس سے دلفریب منظر تو میں بریلی میں دیکھ کر آ رہا ہوں۔ جب دلہن رخصت ہوئی تھی تو ڈولی کے اوپر سے پیسے نچھاور کیے گئے تھے۔ بھوکوں کی ایک بہت بڑی ٹولی ان پیسوں کو حاصل کرنے کے لیے دیوانہ وار جھپٹی تھی، دو مزدور بچے آپس میں اس طرح ٹکرائے تھے کہ دنوں کے سر سے خون بہنے لگا تھا اور ایک مزدور عورت پیسے کو اٹھاتے اٹھاتے گندے نالے میں جا گری تھی، جسے بڑی مشکل سے نکالا گیا تھا اور ایک بوڑھا فقیر پیسے کا تعاقب کرتے ہوئے بری طرح زمین پر گر پڑا تھا اور باقی محتاج اس کے جسم کو روندتے ہوئے آگے دوڑے تھے۔ کتنا پر لطف تھا یہ منظر۔ لیکن اس سے بھی خوب تر وہ منظر تھا جب بارات کھانا کھا رہی تھی اور ہزاروں بھوکے لوگ نظروں میں صدیوں کی بھوک لیے قنات کے ارد گرد منڈلا رہے تھے اور منتظمین انہیں فحش گالیاں دے رہے تھے۔ ''سالے، حرامزادے''، ''بھک منگے، اوباش۔ خدا جانے گدھوں کی طرح اتنے کہاں سے آ جاتے ہیں۔ کسی کو کھانا بھی نہیں کھانے دیتے۔ بھاگ جاؤ۔ نہیں تو وہ مار پڑے گی کہ یاد رکھو گے..... اچھا اچھا سن لیا تم تین دن سے بھوکی ہو۔ سب یہی کہتے ہیں سالے..... اچھا اچھا۔ بارات کھانا کھا لے..... بچا کھچا تم کو ضرور ملے گا۔ اور کیا چاہتی ہو؟..... ایک پوری؟ نہیں۔ نہیں۔ کوئی پوری نہیں ملے گی۔ سالی۔ پوریاں تمہارے ایسوں کے لیے ہیں۔ کھی کھی کھی۔ ذرا اپنا منہ تو دیکھو۔ کھا کھا کھا۔ پھری وہی ایک پوری! بھاگ جاؤ۔ تمہیں کچھ بھی نہیں ملے گا ڈھیٹ کہیں کی!''

اور وہ عورت جو بھوک سے نڈھال ہو رہی تھی جس کی گود میں دودھ پیتا بچہ تھا، آنکھوں میں بڑی حسرت لیے ہوئے ایک طرف چلی گئی۔

نوجوان پھر چلا رہا ہے کہ میں بیکسی کا مزار ہوں

ارے بھئی ہو گے تم بے کسی کے مزار، بن لیا۔ ایک دفعہ، دو دفعہ، دس دفعہ۔ لیکن محض چلانے سے کیا ہوتا ہے۔ ہمت کر کے اٹھ کیوں نہیں بیٹھتے اور مزار کو گرا کر اپنے لیے ایک شیش محل کیوں نہیں بنا لیتے۔

''دہلی دیکھئے ، لال قلعہ دیکھئے

ضرور دیکھیں گے۔لیکن اس تصویر میں آپ نے ان شرنارتھیوں کو کیوں نہیں دکھایا جو فصیل کے باہر اور فصیل کے اندر، سبزی منڈی میں، دریا گنج میں، انند پربت کے نیچے، زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہے ہیں۔شاید آپ نہیں چاہتے کہ لوگ انہیں دیکھنے کے لیے آئیں اور آپ شرم سے پانی پانی ہو جائیں۔کیا فائدہ مفت میں خفت اٹھانے سے۔

پچھلے مہینے میں دہلی گیا تھا اپنے ایک شرنارتھی رشتہ دار سے ملنے، چھ سال سے وہ ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں کہ جو اس نے خود بنائی ہے، رہ رہا ہے۔ یہ جھونپڑی کمیٹی کے حکم سے چار بار گرائی جا چکی ہے اور چار بار بنائی گئی ہے۔ ہر بار اسے یقین دلایا جاتا ہے کہ کل اسے ایک نیا مکان رہنے کے لیے دے دیا جائے گا۔لیکن آج تک وہ کل نہیں آئی۔شاید کبھی نہیں آئے گی۔اور ایک دن جب اس کی ارتھی اٹھ رہی ہوگی تو اسے شمشان میں مژدہ سنایا جائے گا کہ سرکار نے تمہارے لیے ایک نیا مکان تعمیر کر لیا ہے، اگر چاہو تو شمشان کی بجائے اس میں آرام کر سکتے ہو۔

گاڑی اب آیا چاہتی ہے۔مسافر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔اپنے اپنے ٹرنک اور پوٹلیاں سنبھال رہے ہیں۔ میں بھی پلیٹ فارم پر جانے کی تیاری کر رہا ہوں اور ساتھ ساتھ سوچ رہا ہوں کہ یہ کیسا ملک ہے..... کہ

- جہاں، سترہ سالہ حسین دوشیزہ کی تمناؤں کو اس بے دردی سے مسلا جاتا ہے۔
- جہاں، سائیں بابا کو پرماتما کے نام پر پیسہ نہ دینے سے آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔
- جہاں، بخشیش۔ بخشیش کی صدائیں سن کر کان پک جاتے ہیں۔ جہاں ہر شخص بے کسی کا مزار ہے۔

ہندوستان دیکھئے!

بہت دیکھ لیا صاحب، اب اور کیا دیکھیں گے؟

☆☆☆

میں ریڈیو کے لیے کس طرح لکھتا ہوں؟

میں ریڈیو کے لیے کس طرح لکھتا ہوں؟ اس سوال کا صاف اور سیدھا جواب تو یہ ہے کہ جس طرح آپ لکھتے ہیں۔ لیکن ممکن ہے کہ آپ ریڈیو کے لیے نہ لکھتے ہوں۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے ہی بتانا پڑے گا۔ تو لیجئے۔ میں ریڈیو کے لیے بالکل اسی طرح لکھتا ہوں، جس طرح مجھے ریڈیو والے لکھنے کے لیے کہتے ہیں۔ نکتہ اس انکشاف میں یہ ہے کہ جب تک ریڈیو والے آپ سے لکھنے کے لیے نہ کہیں، آپ ریڈیو کے لیے لکھ ہی نہیں سکتے۔ اگر آپ محض ادیب ہیں تو سمجھ لیجئے کہ آپ ریڈیو کے لیے کبھی نہیں لکھ سکتے۔ یعنی آپ کی ادبی حیثیت ریڈیو والوں کی نگاہ میں صفر تسلیم کی جائے گی۔ ہاں اگر اس قسم کی غزلیں کہتے ہیں جن میں بت کم سن اور رقیب روسیاہ کا ذکر رہتا ہے یا ایسے افسانے لکھتے ہیں جو محبت کی واردات سے شروع ہو کر خودکشی کی واردات پر ختم ہوتے ہیں، تو بلاشبہ آپ سے ریڈیو کے لیے لکھنے کی درخواست کی جائے گی۔

ایک اور بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے، یہ ہے کہ ریڈیو اسٹیشن تک آپ کی رسائی اسی حالت میں ہو سکتی ہے جب آپ ریڈیو اسٹیشن کے افسروں سے رسم و راہ پیدا کر لیں۔ یہ کوئی مشکل بات نہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آپ اپنے احباب کو ریڈیو کے محکمے میں ملازمت کرنے پر آمادہ کریں۔ اگر آپ کا ایک دوست بھی اس محکمے میں ملازم ہو گیا تو جب تک اس کی ملازمت سلامت ہے، آپ ریڈیو کے لیے لکھتے رہیں گے۔ بالفرض آپ کا کوئی دوست ریڈیو کی ملازمت کرنے پر رضامند نہیں ہوتا تو پھر بہر حال آپ کو ان لوگوں کی باریابی ضرور حاصل کرنا ہو گی جو ریڈیو اسٹیشن پر خدایانا خدا کی حیثیت سے قابض ہیں۔ یعنی دائرکٹر۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر، پروگرام ایگزیکٹو وغیرہ۔ ڈائرکٹر سے ملاقات کرنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے، کیونکہ خدا کا یہ برگزیدہ انسان عموماً ملاقاتیوں کو یہ کہہ کر ٹال دیتا ہے کہ اس کے پاس ملاقات کے لیے وقت نہیں ہے۔ حالانکہ دیکھا جائے تو دو چار ضروری کاغذات پر دستخط کرنے کے علاوہ اس کے پاس کوئی کام نہیں ہوتا۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر عموماً دین و دنیا سے اس قدر بیزار رہتا ہے کہ اس سے ملاقات کرنے کے بعد ملاقاتی کچھ لکھنے کی بجائے خودکشی کرنا زیادہ مناسب سمجھتا ہے۔ اس لیے اگر آپ پروگرام ایگزیکٹو سے ملنے کی کوشش کریں تو بہتر ہو گا۔ پہلے ٹیلیفون پر اس سے ملاقات کا مناسب دن اور

وقت دریافت کریں۔ اور پھر دو چار انگریزی یا فرانسیسی ناول بغل میں داب کر اس کے دفتر میں جا دھمکیں، گفتگو اس قسم کی ہونی چاہیے۔

''آداب عرض ہے''۔

''مدت سے خواہش تھی کہ آپ سے شرف نیاز حاصل کیا جائے''۔

''آپ تو اردو، ہندی، بنگالی اور گجراتی کے مانے ہوئے ادیب ہیں''۔

''وہ ناول جو آپ پچھلے پندرہ برس سے لکھ رہے تھے، اس کا پہلا باب آپ نے لکھ لیا یا ابھی اس کا پلان بنا رہے ہیں''۔

''جب سے آپ یہاں تشریف لائے ہیں، پروگرام یقیناً بہتر ہو گئے ہیں، اب تو کبھی کبھی تقریریں سننے کو بھی جی چاہنے لگا ہے''۔

''یہ پریم کور تو آپ کی دریافت معلوم ہوتی ہے۔ آپ کے آنے سے پہلے اسے کوئی منہ نہیں لگاتا تھا''۔

''آپ نے یہ فرانسیسی ناول پڑھا۔ اگر آپ اسے گجراتی میں منتقل کریں تو کیسا رہے گا''۔

ان باتوں کے جواب میں اگر پروگرام ایگزیکٹو سمجھ دار ہے تو برابر مسکراتا رہے گا۔ اگر نہیں ہے تو شیخی بگھارنے لگے گا۔ آپ اس کی باتوں سے ذرہ بھر بھی مرعوب نہ ہوتے ہوئے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے جائیے۔ اگر وہ کہے کہ فرصت ہی کتنی ملتی ہے کہ کوئی اپنے ناول کا پہلا باب مکمل کر سکے، تو آپ کو فوراً کہنا چاہیے۔ ''بجا ارشاد ہوا۔ یقیناً اگر آپ کسی اور محکمے میں ہوتے تو اس وقت تک دو درجن ناولوں کے مصنف ہوتے'' اگر وہ کسی جرمن یا جاپانی مصنف کا حوالہ دے جس کا تازہ ناول وہ پڑھ رہا ہے تو آپ دس بارہ فرضی ڈچ یا چینی مصنفوں کے نام گنوا دیجئے، جن کے تمام ناول آپ پڑھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس ملاقات سے آپ کو یہ فائدہ ہوگا کہ آئندہ آپ پروگرام ایگزیکٹو کی نگاہ میں رہیں گے، اور وہ جب بھی نیا سلسلہ (SERIES) شروع کرے گا، ایک آدھ تقریر آپ کو مل جائے گی۔

دوسری بات جو آپ کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے، یہ ہے کہ ریڈیو والے ہمیشہ تقاریر کے سلسلے تجویز کرتے ہیں۔ مثلاً سلسلہ ہوگا ''کیسے چلتی ہے'' اور اس میں تقاریر کے عنوانات ہوں گے:۔

(1) کھوٹی اٹھنی (2) زنگ خوردہ بندوق (3) بات سے بات

(4) پنڈت جی کی بیلی (5) بدمزاج بیوی کی زبان

اب آپ اس پر نہ جائیے کہ یہ ''سلسلہ'' کتنا مضحکہ خیز ہے یا اس میں تقاریر کے عنوانات کتنے عجیب وغریب ہیں۔ بلکہ ع ''فکر ہر کس بقدر حمت اوست'' کے مصداق اسے نظر انداز کر دیجئے اور چپکے سے تقریر لکھ ڈالیے۔ اس ضمن میں ایک انکشاف آپ کی مدد کر سکتا ہے۔ وہ یہ کہ قریب قریب ہر ریڈیو اسٹیشن ایک ہی قسم کے سلسلے نشر کرتا ہے۔ اس لیے آپ غور سے ہر اسٹیشن کا پروگرام سنئے۔ کوئی نہ کوئی وہی تقریر نشر کر رہا ہوگا کہ جو آپ کو کرنا ہے۔ اس لیے آپ وہ ساری کی ساری تقریر نوٹ کر لیجئے اور پھر تاریخ مقررہ پر نشر فرما دیجئے۔

بعض اوقات تقاریر کے نئے سلسلے پر کسی مشہور شاعر کا کوئی چلتا ہوا مصرع چسپاں کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر۔ ع 'یہ نہ تھی ہمارے قسمت کہ''۔

(1) ہم خاکروب ہوتے؟ (2) ہم چڑی مار ہوتے؟

(3) ہم سمجھ دار ہوتے؟

.....یا..... ''تنگدستی اگر نہ ہو غالب''

(1) بے حیائی ہزار نعمت ہے! (2) دو سیاہی ہزار نعمت ہے!

(3) بد دماغی ہزار نعمت ہے!

جب صورت حال یہ ہو تو آپ غالب کی روح سے معذرت کیے بغیر تقریر کا آغاز کر دیں کیونکہ اگر آپ یہ سوچنے لگے کہ غالب مرحوم پر جنت میں کیا گزرے گی تو آپ تقریر نہیں کر سکیں گے۔

تقاریر کے علاوہ ریڈیو والے آپ سے فیچر اور ڈرامے بھی لکھواتے ہیں۔ فیچر ریڈیو کی خاص ایجاد ہے۔ اس کو عام طور پر وہ لوگ لکھتے ہیں، جو فیچر سے بہتر چیز لکھنے کے اہل نہیں۔ چونکہ معاوضہ کافی ملتا ہے، اس لیے فیچر نویسی ہرگز خسارے کا سودا نہیں۔ فیچر موسموں، شہروں، کھٹملوں اور گلہریوں پر لکھے جاتے ہیں۔ کسی خاص موسم پر فیچر لکھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس موسم سے متعلق جتنے گیت، نظمیں یا غزلیں ملیں، انہیں اکٹھا کر لیجئے اور پھر پانچ دس سطور خود لکھئے اور ایک سطر کے بعد دو تین بلکہ چار گیت نقل کرتے جائیے۔ مثلاً آپ کو ''بسنت'' پر فیچر لکھنا ہے تو

زیادہ سے زیادہ آپ کو مندرجہ ذیل طبع زاد فقرے لکھنا ہوں گے:۔

''بسنت! آہا ہا بسنت! یعنی واہ واہ۔ بسنت کا موسم ہے۔ جدھر دیکھو بسنت۔ دائیں بائیں آگے پیچھے بسنت! ساتویں آسمان کے علاوہ ہر جگہ بسنت۔ ریڈیو اسٹیشن پر بہار ہی بہار نظر آتی ہے۔ ڈائرکٹر صاحب کو شاید یرقان ہو گیا ہے۔ اس لیے انہیں ہر چیز پیلی پیلی نظر آ رہی ہے۔ وہ دیکھئے، ارے وہ بسنتی کپڑوں میں ملبوس خوبصورت لڑکیاں بسنت کے گیت گا رہی ہیں اور ادھر بدصورت لڑکے ان کا منہ چڑا رہے ہیں۔ آیئے یہاں سے کہیں دور بھاگ چلیں ورنہ ہمیں یہ گیت سننا پڑیں گے۔

اگر آپ کو کسی شہر پر فیچر لکھنا مقصود ہے تو یوں لکھئے:۔

''دلی! ہندوستان کا دل ہے۔ ہندوستان ایشیا کا دل ہے اور ایشیا خدا جانے کس کا دل ہے۔ بہرحال کسی کا ہوگا۔ دلی کئی بار اجڑی اور کئی بار بسی اور اب اجڑنے کا نام نہیں لیتی۔ دلی بہر حال دلی ہے، یعنی لکھنؤ یا ٹمبکٹو نہیں۔ دلی میں بڑے بڑے باکمال لوگ رہتے ہیں۔ کس کس کا ذکر کیا جائے۔ سبھی باکمال۔ دلی کی گلیوں میں خاص کشش ہے، کیونکہ یہاں بارہ مسالے کی چاٹ بکتی ہے۔ اسی لیے تو انہیں چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ جائے بھی تو کوئی کہاں جائے۔ چاروں طرف دلی ہی دلی ہے۔ یہاں کا ہر فاقہ مست اپنے کو میر یا غالب سمجھتا ہے۔ اللہ اللہ، خود فریبی کی بھی حد ہوتی ہے۔ دلی شہر نہیں، بھول بھلیاں ہے۔ نئی دلی میں راستہ بھول جاؤ تو پرانی دلی میں جا پہنچو اور پرانی دلی میں راستے سے بھٹک جاؤ تو نئی دلی پہنچ جاؤ۔ دلی کی اہمیت تبھی تک ہے جب تک مہا دہلی وجود میں نہیں آتا۔ وغیرہ وغیرہ''۔

اب رہے ریڈیو ڈرامے! ریڈیو ڈراما لکھنے کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ کبھی طبع زاد ڈراما لکھنے کی غلطی نہ کی جائے۔ اول تو پلاٹ ہی مشکل سے ملتا ہے۔ پلاٹ مل جائے تو مناسب کلائمیکس نہیں سوجھتا۔ کلائمیکس بھی سوجھ جائے تو اختتام کا مسئلہ اچھی خاصی الجھن پیدا کر دیتا ہے۔ ان مشکلوں سے بچنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ ہمیشہ کسی انگریزی انتخاب کی طرف رجوع کیجئے جس کا نام ہو۔ ''1955ء کے بہترین ناٹک'' انیسویں صدی کے مشہور ایک ایکٹ کے ڈرامے''۔

اس کتاب سے پلاٹ، کردار، زبان اڑا کر انہیں ہندوستانیت کا رنگ دے دیجئے۔ اگر اصل ڈرامے کا نام ہے، ''کھٹے انگور'' تو اب اس کا نام رکھ دیجئے۔ ''میٹھا آلو بخارا'' لیجئے ڈراما تیار

ہے۔ معمولی ترمیمیں تو ہوں گی ہی۔ مثلاً ہیرو کا نام ''ولیم'' کی بجائے ''ولی علیم'' ہوگا اور ہیروئن لیلیٰ کی بجائے لیلیٰ کے نام سے پکاری جائے گی۔ اگر آپ ایسا ڈرامہ لکھ دیں گے تو نہ صرف ریڈیو والے آپ کی ذہانت کی داد دیں گے بلکہ مبلغ تیس روپے کا چیک بھی آپ کی خدمت میں پیش کریں گے۔

ایک آخری بات اور یاد رکھئے۔ جب کبھی آپ ریڈیو پر تقریر کریں یا آپ کا لکھا ہوا کوئی فیچر یا ڈراما نشر کیا جائے تو اس سے اگلے دن آپ اپنے احباب کو لکھیں کہ وہ آپ کی تقریر، ڈرامے یا فیچر کے بارے میں تعریفی خطوط ریڈیو سٹیشن ڈائرکٹر کے نام بھجوائیں۔ اگر ہو سکے تو چھ سات خطوط آپ خود لکھ کر فرضی ناموں کے تحت ڈائرکٹر صاحب کو بھجوا دیں۔ مضمون یہ ہونا چاہیے۔

''محترمی!

بڑی مدت کے بعد آپ کے اسٹیشن سے ایک اچھا فیچر سننے کو ملا۔ میری مراد ''میر معلوم ہے قلندر تھا'' سے ہے۔ ملنگ شمشانوی صاحب نے میر کی قلندری کا نقشہ جن الفاظ میں کھینچا ہے وہ بعینہٖ میر کے اپنے الفاظ ہی ہیں۔ امید ہے آپ یہی فیچر دوبارہ بلکہ سہ بارہ سنوائیں گے۔ ہاں اگر مناسب سمجھیں تو ملنگ صاحب سے کہیں کہ ایک فیچر ''پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں'' پر آپ کو لکھ کر دیں۔

تو لیجئے۔ یہ ہے ریڈیو کے لیے لکھنے کی تکنیک۔ اللہ توفیق دے تو آپ بھی ریڈیو کے لیے لکھا کیجئے۔ دلچسپ شغل ہے اور پھر جیسا کہ ملنگ صاحب نے کہا ہے۔ ''آم کے آم گٹھلیوں کے دام!''

☆☆☆

جانا حاتم طائی کا اسنو میں کی تلاش میں

حاتم طائی جب اپنے ساتویں سفر سے گھر لوٹا تو مسز حاتم طائی اسے دیکھ کر پہلے تو ہنسی اور پھر رونے لگی۔ یہ ماجرا دیکھ کر حاتم طائی بہت حیران ہوا اور اپنی اہلیہ کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ''اے نیک بخت! سچ سچ بتا دل کی بات زبان پر لا کہ تو مجھے دیکھ کر ہنسی کس لیے اور روئی کیوں؟'' مسز حاتم طائی نے جواب میں کہا۔ ''ہنسی تو اس لیے کہ اتنی مدت کے بعد تمہاری شکل دیکھنا نصیب ہوئی اور روئی اس لیے کہ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے، تم ایک دن بھی میرے پاس

نہیں رہے۔ ہمیشہ اغیار کی خاطر جنگلوں اور صحراؤں کی خاک چھانتے رہے''۔ حاتم طائی نے جب بیوی کی یہ شکایت سنی تو پہلے تو خوب کھل کر ہنسا اور پھر یک لخت سنجیدہ ہو گیا۔ ''اے نیک بخت!'' حاتم طائی نے روٹھی رانی کو مناتے ہوئے کہا۔ ''کیا تجھے معلوم نہیں کہ کامیاب ازدواجی زندگی کا راز اس میں ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، خاوند اور بیوی ایک دوسرے سے دور رہیں۔ نہیں تو نوبت گالی گلوچ اور لڑائی جھگڑے سے ہوتی ہوئی طلاق تک پہنچتی ہے۔ رہا تمہارا یہ وہم کہ میں ہمیشہ اپنوں کی بجائے دوسروں کے کام آیا ہوں تو اس ضمن میں ایک شعر سن اور ہو سکے تو اسے سمجھنے کی کوشش کر۔ وہ شعر ہے:''

پہلے تو فنا کا درجہ ہے اور بعد بقا بھی ملتی ہے
وہ جینے کا نام نہ لے جو مرنے کو تیار نہیں

مسز حاتم نے شعر سن کر برجستہ کہا۔ ''سبحان اللہ! آفرین ہے تم پر، اگر یہ شعر تمہارا ہے اور اگر کسی اور کا ہے پھر بھی تم پر آفرین کہ شاعر نے ضرور تمہیں دھیان میں رکھ کر یہ شعر کہا ہو گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ تم کب تک دوسروں کی خاطر یونہی فنا ہوتے رہو گے؟ میرا تو خیال ہے کہ عمر عزیز کا کافی حصہ برباد کر چکے ہو۔ عاقبت کا خیال چھوڑو اور دنیا کی فکر کرو''۔

حاتم طائی نے مسکرا کر کہا۔ ''یہ ناممکن ہے۔ میرے پاؤں میں ازل سے چکر ہے اور ابد تک رہے گا۔ میں اب اپنی زندگی کی سب سے کڑی مہم پر روانہ ہونے والا ہوں''۔

''یہ آٹھواں سفر کس سلسلے میں ہے؟''

''اسنو مین! کی تلاش میں!''

''اسنو مین! وہ کیا بلا ہے؟''

''اے نیک بخت! اسنو مین بلا نہیں۔ ہماری تمہاری طرح گوشت پوست کا انسان ہے۔ فرق اس میں اور ہم سب میں صرف اتنا ہے کہ وہ اینٹ اور سیمنٹ کے مکانوں کی بجائے ہمالیہ کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں پر قیام کرتا ہے۔''

''تم اس کی تلاش میں کس لیے جانا چاہتے ہو؟''

''یہ ایک سب ایڈیٹر (SUBEDITOR) کی ملازمت کا سوال ہے، اس کے باس (BOSS) نے اسے اخبار کے سال نامے میں ایک مضمون اسنو مین پر لکھنے کے لیے کہا ہے۔

اگر اس نے یہ مضمون نہ لکھا تو اسے ملازمت سے برطرف کر دیا جائے گا۔ اس بدنصیب کی ایک بیوی اور سات بچے ہیں اگر اسے جواب مل گیا تو یقیناً وہ سب فاقوں سے مریں گے۔ اچھا اب خدا حافظ کہ وقت قلیل اور راستہ طویل ہے"۔

اتنا کہنے کے بعد حاتم طائی اللہ کا نام لے کر اسنوبین کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ کھیتوں مرغزاروں سے گزرتا، جنگلوں اور بیابانوں کی خاک چھانتا وہ ایک صحرائے لق ودق میں پہنچا۔ جہاں اس کی ملاقات ایسے اشخاص سے ہوئی جنہوں نے اپنے چہروں پر آہنی خول چڑھا رکھے تھے اور جن کے آس پاس عجیب وغریب آلات اور مشینیں بکھری پڑی تھیں۔ حاتم طائی یہ منظر دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس نے ان کے قریب جا کر کہا "اے صاحبو! یہ کیا مذاق ہے۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ تم لوگ کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

ان میں سے ایک نے جواب میں کہا۔ "اے نووارد! تمہیں یقین آئے یا نہ آئے۔ ہم آدم زاد ہیں اور ایک نئے بم کو چلانے کا تجربہ کرنے کے لیے اس صحرا میں آئے ہیں"۔

حاتم طائی نے لاحول پڑھتے ہوئے کہا۔ "صاحبو! میری مانو تو اس حماقت سے باز آؤ اور واپس اپنے ملک چلے جاؤ۔ نئے بم بنانے اور چلانے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ انسان کسی کی بگڑی بنائے اور جہاں اچھی بات رک گئی، ہو وہاں سے اسے آگے چلائے"۔

"معلوم ہوتا ہے کہ فلسفی ہو یا سر پھرے، ورنہ ایسی بہکی بہکی باتیں نہ کرتے"۔

"خاموش! تم شاید نہیں جانتے کہ میرا نام حاتم اور پیشہ خدمتِ خلق ہے"۔

"تو جاؤ خدمتِ خلق کرو۔ ہم سے خوامخواہ کیوں الجھ رہے ہو؟"

حاتم نے اس شخص کی عقل کا ماتم کرتے ہوئے ایک شعر پڑھا اور وہاں سے آگے چلا۔ متواتر سات دن اور سات راتیں چلنے کے بعد وہ ایک شہر میں پہنچا۔ رات ایک ہوٹل میں بسر کرنے کا ارادہ کیا۔ ہوٹل کے ایک بیرے نے اسے بتایا کہ رات کے وقت ایک اڑن طشتری شہر کے اوپر پرواز کرتی ہے کہ جس کی ہیئت اور رفتار دیکھ کر بچے چیخنے لگتے ہیں اور بزرگ لحافوں میں گھس جاتے ہیں۔ حاکمِ شہر نے دس ہزار روپے کا انعام اس شخص کو دینا منظور کیا ہے جو اس اڑن طشتری کا پتا چلائے۔ حاتم نے پورے وثوق سے کہا۔ "میں اس طشتری کا راز طشت از بام کر سکتا ہوں"۔ چنانچہ اسی رات ایک ہوائی جہاز میں بیٹھ کر حاتم اڑن طشتری کی کھوج لگانے کے لیے

روانہ ہوا۔ کافی عرصہ فضا میں چکر کاٹنے کے بعد حاتم کو ایک چمکتی اور اڑتی ہوئی چیز نظر آئی۔ اس نے ہوائی جہاز کا رخ اس کی طرف پھیر دیا۔ متواتر دو گھنٹے کے تعاقب کے بعد حاتم کو پتہ چلا کہ وہ چاند کا تعاقب کرتا رہا ہے۔ حاتم کو اپنی غلطی پر بہت افسوس ہوا کہ خوامخواہ اتنا وقت ضائع کیا۔ وہ مایوس ہو کر لوٹنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ دفعتاً کوئی چیز اس کے جہاز میں گری۔ حاتم نے غور سے دیکھا۔ وہ ایک چکور تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اڑتے تھک گیا ہے۔ حاتم نے چکور کو اپنے بڑے کوٹ کی جیب میں ڈالا اور نیچے اترا۔ دوسرے دن اس نے حاکم شہر کی خدمت میں چکور پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''عالی جاہ! جسے آپ غلطی سے اڑن طشتری سمجھتے رہے ہیں، وہ دراصل چکور ہے کہ روز ازل سے چاند کا عاشق ہے''۔ دس ہزار روپے اور دو سنہری تمغے انعام میں پائے اور وہاں سے منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوا۔

چلتے چلتے حاتم کوہ ہمالیہ کی ترائی میں پہنچا۔ رات ایک درخت پر بیٹھ کر کاٹی۔ صبح اس کی ملاقات ایک شرپا سے ہوئی۔ شرپا نے حاتم طائی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''اسنومین کی تلاش بے سود ہے۔ اس کا مقام ہمالیہ کی ان چوٹیوں پر ہے جہاں انسان کی رسائی ناممکن ہے۔ تم اس جستجو سے باز آؤ اور واپس گھر چلے جاؤ''۔

''لیکن شرپا بہادر یہ ایک سب ایڈیٹر کی ملازمت کا سوال ہے، اگر اس نے اسنومین پر مضمون نہ لکھا تو.....''

''کچھ بھی ہو، اسنومین کا سراغ لگانا ناممکن ہے''۔

حاتم طائی نے آؤ نہ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ شرپا بہادر کو دس ہزار روپے کی تھیلی پیش کر دی۔ شرپا نے مسکرا کر کہا۔ ''میں تمہاری مدد کرنے کے لیے تیار ہوں''۔

حاتم طائی اور شرپا نے تین کیمپ قائم کرنے کا فیصلہ کیا، پہلا دس ہزار فٹ، دوسرا تیس ہزار فٹ اور تیسرا پچیس ہزار فٹ کی بلندی پر۔ انہوں نے آکسیجن سلنڈر، وائرلیس سیٹ، برف کو کاٹ کر راستہ بنانے کے کلہاڑے وغیرہ خریدے۔ دو ایک دن دوسرے کیمپ میں آرام کرنے کے بعد وہ تیسرے کیمپ کی طرف روانہ ہوئے۔ ابھی مشکل سے ایک ہزار فٹ کا فاصلہ طے کر پائے تھے کہ طوفان میں گھر گئے۔ برف پڑنے لگی، سرد ہوا کے تیز اور تند جھونکوں نے اوسان خطا کر دیے۔ خون منجمد ہونے لگا۔ حاتم نے طوفان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اے قہر ہمالیہ! تو

کیوں خوامخواہ ہم سے جنگ کرتا ہے اور ہمارا قافیہ تنگ کرتا ہے''۔

شرپا نے ازراہِ مذاق حاتم سے کہا۔''اے حاتم! یہ طوفان تمہارا قافیہ کیا تنگ کرے گا۔ تمہارا قافیہ تو پہلے ہی تنگ ہے کہ سوائے حاتم کے حاتم کو کوئی قافیہ ہی نہیں۔تم نے غلطی یہ کی کہ موسم کی جانچ پڑتال کرنے والوں کی پیش گوئی پر یقین نہ کیا اور سوچے سمجھے بغیر دوسرے کیمپ سے چل نکلے''۔

ایک گھنٹے کے بعد طوفان تھما۔حاتم اور شرپا تیسرے کیمپ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

دوسرے دن حاتم نے وائرلیس پر یہ اعلان سنا کہ تین دن کے لیے موسم خوشگوار رہے گا۔اس نے یہ موقع غنیمت جانا اور شرپا کو ساتھ لے کر اسنو مین کی تلاش میں نکلا۔چاروں طرف گھنا جنگل تھا۔ہر طرف برف ہی برف نظر آتی تھی۔چرند پرند، آدم زاد، پری زاد کا کوسوں تک نشان نہ تھا۔ انہوں نے جنگل کا کونا کونا چھان مارا۔لیکن اس بھلے مانس یا بن مانس کا کہیں پتا نہ ملا۔آخر تھک ہار کر شرپا نے کہا۔''اے حاتم! معلوم ہوتا ہے کہ بے چارا اسنو مین اللہ کو پیارا ہو گیا''۔

''تو پھر؟''

''ہمیں واپس چلنا چاہیے۔اگر زیادہ عرصہ یہاں ٹھہرے تو ہم بھی اللہ کو پیارے ہو جائیں گے''۔

''لیکن اس سب ایڈیٹر کا کیا ہو گا؟''

''زیادہ سے زیادہ اسے ملازمت سے جواب مل جائے گا''۔

''جواب؟ تم بڑے بے رحم ہو۔یہ بھی نہیں سوچتے کہ اس کم بخت کی ایک بیوی اور سات بچے ہیں''۔

''میں اپنی سات بیویوں اور ایک بچے کے متعلق سوچ رہا ہوں''۔

''تم بڑے خود غرض ہو''۔

''آخر تم چاہتے کیا ہو؟''

''تلاش جاری رکھی جائے''۔

دوسرے دن حاتم اور شرپا نے برف پر کسی عجیب و غریب جانور کے پنجوں کے نشانات دیکھے۔حاتم نے خوشی سے چلا کر کہا۔''مل گیا۔مل گیا''۔شرپا نے پوچھا۔''کیا؟'' حاتم نے کہا'' اسنو مین کا سراغ''۔

دونوں ان نشانات کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے ایک غار کے قریب پہنچے۔ حاتم نے غار کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔ ''اے عجیب و غریب مخلوق! اپنے مسکن سے باہر نکل کر دیکھ کہ تجھے کون ملنے آیا ہے۔ خدا کے لیے اب زیادہ انتظار مت دکھا اور جلدی سے غار سے باہر آ''۔

غار میں سے کوئی جواب نہ آیا۔ حاتم نے ایک بڑا سا پتھر لے کر غار کی طرف پھینکا۔ ایک خوفناک قسم کا جانور کہ جو ریچھ اور گینڈے کا مرکب معلوم ہوتا تھا، غراتا ہوا باہر نکلا اور حاتم اور شرپا کا تعاقب کرنے لگا۔ دونوں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے اور کیمپ میں جا کر دم لیا۔

تیسرے دن ناشتا کرنے کے بعد حاتم نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ اس مہم میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ میری پہلی شکست ہوگی''۔

''مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ مالک کارساز ہے''۔

''کوئی صورت نظر نہیں آئی''۔

''ایک تدبیر میری سمجھ میں آئی ہے''۔

''کہو''۔

میری رائے میں شراب انسان کی، چاہے وہ اسنومین ہی کیوں نہ ہو، پہلی اور آخری کمزوری ہے۔ اگر ہم جگہ جگہ شراب کی بوتلیں رکھ دیں تو کام بن سکتا ہے''۔

''تجویز تو خاصی معقول ہے''۔

اس دوپہر کو حاتم اور شرپا نے جنگل میں مختلف جگہوں پر شراب کی بوتلیں رکھ دیں، شام کے وقت جب وہ چہل قدمی کرنے کو نکلے تو انہوں نے دور سے دیکھا کہ ایک لنگور نما انسان بوتل کو منہ سے لگا کر حلق میں شراب انڈیل رہا ہے۔ حاتم کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ اور شرپا بھاگم بھاگ اس شخص کے پاس گئے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے مخاطب کرتے، اس نے بڑے تپاک سے کہا۔ ''ہیلو حاتم طائی! تم یہاں کیسے؟''

حاتم طائی نے حیران ہوتے ہوئے جواب دیا۔ ''ہیلو اسنومین! تو گویا تم مجھے جانتے ہو''۔

اس شخص نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ''نہ صرف یہ بلکہ تم بھی مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔ میں ایس۔ ایچ سحر انیم ہوں۔ اخبار ہسٹارک ٹائمز کا سب ایڈیٹر''۔

''لیکن یہ حلیہ تم نے کیا بنا رکھا ہے؟''۔

''تمہارا اشارہ لنگور کی کھال کی طرف ہے جو میں نے پہن رکھی ہے۔ یہ جتن تو اسنومین کو دھوکا دینے کے لیے کیا گیا ہے، اسنومین انسان سے بدکتا ہے۔ اس لیے میں لنگور کی کھال پہن کر اس کی تلاش میں نکلا ہوں کہ کہتے ہیں۔ ع

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز!

''اچھا تو تم بھی اسنومین کی تلاش میں ہو؟''

''ہاں! بات دراصل یہ ہوئی کہ جب دو مہینے انتظار کرنے کے بعد تمہاری کوئی خبر نہ ملی تو میں نے سوچا کہ خود ہی چل کر اسنومین کا سراغ لگایا جائے''۔

''تو کچھ پتا چلا؟''

''ابھی تک تو کچھ سراغ نہیں ملا''۔

''تو پھر؟''

''ملازمت سے جواب مل جانا یقینی ہے''۔

''یہ تو بہت برا ہوگا''۔

''کیا کیا جائے کوئی چارہ نہیں''۔

اس اثنا میں شرپا بالکل خاموش کھڑا رہا۔ یک لخت اس نے شری ایس۔ ایچ سبھرا نیم اور حاتم طائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اے صاحبو! میری مانو تو کام اب بھی بن سکتا ہے''۔

حاتم نے پوچھا۔ ''کیسے؟''

شرپا بولا۔ ''لنگور کے بھیس میں شری ایس ایچ سبھرا نیم اچھے خاصے اسنومین نظر آتے ہیں کیوں نہ اس لباس میں ان کی چند تصاویر لی جائیں اور انہیں اسنومین کے روپ میں پیش کیا جائے ہے پنجوں کے نشانات وہ کسی بھی جنگلی جانور کے لیے جا سکتے ہیں''۔

''وہ مارا'' حاتم نے خوشی سے ناچتے ہوئے کہا۔

''آفرین!'' شری ایس۔ ایچ سبھرا نیم نے نعرہ لگایا۔

چنانچہ لنگور کے بھیس میں شری ایس۔ ایچ سبھرا نیم کی متعدد تصویریں کھینچی گئیں۔ ایک عجیب و غریب جنگلی جانور کے پنجوں کے نشانات کی فوٹو لی گئی اور تینوں خوشی خوشی اپنے اپنے گھر واپس آئے۔

☆☆☆

مشاغل

کردار:.....

☆.....تک بند

☆.....مس فراوَن

☆.....مرزا خدشہ

☆.....میاں شکی

☆.....حلیم

مقام:.....

☆.....ویٹنگ روم

تک بند: خواتین وحضرات! یہ تو ظاہر ہے کہ صبح سے پہلے گاڑی نہیں مل سکتی اور ویٹنگ روم میں اتنے مچھر ہیں کہ دم بھر چین نہیں لینے دیتے۔ سونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چپ چاپ بیٹھنے اونگھنے کی بجائے ایک دوسرے سے تعارف حاصل کیا جائے تا کہ وقت بھی کٹ جائے اور طبیعت بھی بشاش رہے۔

مس فراوَن: تجویز تو معقول ہے۔ تو آپ ہی بسم اللہ کیجئے نا۔

تک بند: خاکسار کو تک بند کہتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ میرا نام ہے تخلص نہیں۔

مس فراوَن: حالانکہ تخلص بھی ہوتا تو کوئی مضائقہ نہیں تھا۔

تک بند: بجا فرماتی ہیں آپ۔ لیکن اگر تخلص ہوتا تو پھر مجھے تک بندی کی بجائے شاعری کرنا پڑتی، اس لیے خدا کا شکر ہے کہ یہ تخلص نہیں۔

مس فراوَن: آپ کا شغل؟

تک بند: شغل نام ہی سے ظاہر ہے۔ یعنی تک سے تک جوڑنا۔ دوسرے لفظوں میں قافیہ بندی۔ رات کا قافیہ برسات اور برسات کا قافیہ ملاقات سے ملاتا ہوں۔ حسن یار کا قافیہ نرگس بیمار اور موخر الذکر کا قافیہ مصر کے بازار سے جوڑتا ہوں۔ واللہ وہ لطف

آتا ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔

مس فراوَن: سبحان اللہ۔ آپ تو اچھے خاصے شاعر ہیں۔ حالانکہ تک بند آپ کا نام ہے تخلص نہیں۔

تک بند: جی نہیں میں شاعر نہیں ہوں۔ شعر کہنے کی لیے بڑا پتا مارنا پڑتا ہے۔ اور میرا پتا ذرا کمزور ہے۔

مس فراوَن: تو آپ نثر کیوں نہیں لکھتے۔ آخر تک بندی میں کیا دھرا ہے۔

تک بند: اچھی نثر لکھنا بھی کون سا آسان کام ہے۔ بڑے بڑوں کو خیر و عافیت معلوم ہو جاتی ہے۔

مس فراوَن: لیکن سوال یہ ہے کہ تک بندی کا فائدہ؟

تک بند: فائدہ یہ کہ جس مجلس میں کلام پڑھتا ہوں، اس میں بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ سامعین خدا کا شکر بجالاتے ہیں کہ مشاعرہ ختم ہوا۔

مس فراوَن: پھر تو آپ بڑے کام کے آدمی ہیں۔

تک بند: آپ کی عنایت ہے۔ اچھا اب آپ اپنے متعلق کچھ فرمایئے۔

مس فراوَن: میرا نام مس فراوَن ہے۔

تک بند: بہت خوبصورت نام ہے۔ میری بھانجی کی بلی کا نام بھی فراوَن ہے۔

مس فراوَن: ہوگا، کچھ لوگ بلیوں کا نام رکھنے میں کافی حماقت کا ثبوت دیتے ہیں۔

تک بند: آپ کا شغل؟

مس فراوَن: شغل ذرا عجیب سا ہے۔ یعنی

تک بند: یعنی؟

مس فراوَن: ناک بھوں چڑھانا۔

تک بند: عجیب شغل ہے۔ ذرا اس کی وضاحت فرما دیجئے۔

مس فراوَن: میں ہر شخص اور ہر چیز کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتی ہوں۔ مثال کے طور پر ان عورتوں پر جو سگریٹ نہیں پیتیں، ان بچوں پر جو اپنے چچا کو انکل نہیں کہتے، ان خواتین پر جن کی گود میں پلّے کی بجائے اپنا بچہ ہوتا ہے۔

تک بند: معلوم ہوتا ہے آپ کی ناک بہت حساس واقع ہوئی ہے۔

مس فراوَن: افسوس ناک حد تک حساس۔ دراصل مجھے ہر اس چیز سے بو آنے لگتی ہے جس پر مغرب کی مہر نہ ہو۔

تک بند: پھر تو آپ کو سورج پر بھی اعتراض ہوگا، کیونکہ یہ ہمیشہ مشرق سے طلوع ہوتا ہے۔

مس فراوَن: مجھے سورج بالکل پسند نہیں۔

تک بند: مشرقی علوم وفنون بھی آپ کا ناپسند ہوں گے؟''

مس فراوَن: بالکل ناپسند۔

تک بند: کالی داس۔ اجنتا اور تاج محل کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

مس فراوَن: مجھے تو ان میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔

تک بند: آپ ایک دن میں کتنی بار ناک بھوں چڑھاتی ہیں۔

مس فراوَن: سیکڑوں بار

تک بند: کافی تھک جاتی ہوں گی۔

مس فراوَن: کئی بار تو اتنا تھک جاتی ہوں کہ اپنے پر ناک بھوں چڑھانے کو جی چاہتا ہے۔

تک بند: اگر آپ دوسروں کی بجائے صرف اپنے پر ناک بھوں چڑھائیں تو زیادہ اچھا ہے۔

مس فراوَن: آپ تو مذاق کرنے لگے..... اچھا اب ذرا ان کی باتیں بھی سن لیں۔ (تیسرے مسافر سے) آپ کی تعریف؟

مرزا خدشہ: ناچیز کو مرزا خدشہ کہتے ہیں۔

مس فراوَن: اف کتنا خطرناک نام ہے۔

مرزا خدشہ: گھبرائیے نہیں۔ یہ میں کافی شریف آدمی ہوں۔

تک بند: کیا آپ کا شغل دریافت کرسکتا ہوں؟

مرزا خدشہ: شغل خاصہ بے ضرر ہے۔ یعنی خطرے کی گھنٹی بجانا۔

مس فراوَن: کون سے خطرے کی؟

مرزا خدشہ: ہر قسم کے خطرے کی..... آپ شاید نہیں جانتے کہ ہم بڑی خطرناک دنیا میں رہ رہے ہیں، یہاں قدم قدم پر خطرہ ہے، آپ نے شاید چند دن ہوئے آسمان پر ایک دم دار ستارہ دیکھا ہوگا۔

مس فراؤن: ہاں ہاں دیکھا تھا۔

مرزا خدشہ: نہایت خطرناک شگون تھا۔

مس فراؤن: وہ کیسے؟

مرزا خدشہ: یہ اس بات کی علامت ہے، کہ قیامت آنے والی ہے۔

مس فراؤن: آپ کو کیسے پتا چلا کہ قیامت آ رہی ہے؟

مرزا خدشہ: دم دار ستارہ جو طلوع ہوا ہے۔

تک بند: اس سے پہلے بھی آپ نے کبھی خطرے کی گھنٹی بجائی ہے؟

مرزا خدشہ: کئی بار، تین ماہ ہوئے ہم نے کہا تھا کہ تیسری عالمگیر جنگ شروع ہونے والی ہے۔

تک بند: لیکن شروع نہیں ہوئی۔

مرزا خدشہ: تھوڑی ہی کسر رہ گئی، ورنہ شروع ہو ہی گئی تھی۔

مس فراؤن: اس کے علاوہ بھی کوئی پیشین گوئی کی؟

مرزا خدشہ: ڈیڑھ ماہ ہوا، ہم نے کہا تھا، قحط پڑنے والا ہے۔

مس فراؤن: لیکن یہ پیشین گوئی بھی غلط ثابت ہوئی۔

مرزا خدشہ: اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر حالات ذرا بدتر ہو جاتے تو قحط پڑ سکتا تھا۔

تک بند: آپ کا طرزِ استدلال لاجواب ہے۔ اچھا یہ فرمائیے کہ یہ خطرے کی گھنٹی جسے آپ بجاتے رہتے، آپ نے کہاں رکھی ہے۔

مرزا خدشہ: رکھنا کہاں تھی قبلہ۔ وہ تو ہمارے دماغ میں ہے۔ جی ہاں! ہمارے دماغ میں۔

مس فراؤن: معلوم ہوتا ہے یہ سب قصور آپ کے دماغ کا ہے۔

تک بند: مرزا صاحب کیا آپ زحمت فرما کر بتا سکتے ہیں کہ اس ویٹنگ روم کی چھت تو گرنے والی نہیں۔

مرزا خدشہ: کوئی بھی چھت کسی وقت بھی گر سکتی ہے۔ دراصل آپ کسی چھت کے متعلق وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ کب تک کھڑی رہے گی اور کب گر پڑے گی۔

تک بند: (چوتھے مسافر سے) آپ کچھ فرمائیے۔

میاں شکی: نام ہے میاں شکی اور شغل ہے شک کرنا۔

مرزا خدشہ: کافی دلچسپ شغل ہے۔تو آپ ہر وقت شک کرتے رہتے ہیں؟

میاں شکی: بجا فرمایا آپ نے۔میں ان لوگوں میں سے ہوں جنہیں اپنے سوا کوئی شخص قابل اعتبار نظر نہیں آتا۔نوکر پر شک کرتا ہوں کہ کہیں میری غیر حاضری میں گھر کا سامان اٹھا کر رفو چکر نہ ہو جائے، باورچی پر شک کرتا ہوں کہ کہیں کھانے میں زہر نہ ملا دے، گلی میں سے گزرتے ہوئے کتوں پر شک کرتا ہوں کہ کہیں مجھے کاٹ نہ کھائیں۔

مس فراؤن: لیکن سوال یہ ہے کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں۔

میاں شکی: میں ضرورت سے زیادہ محتاط اور دانشمند واقع ہوا ہوں۔

تک بند: لیکن ہر شخص پر شک کرنا کہاں کی دانشمندی ہے؟

میاں شکی: دانش مندی کیوں نہیں۔دیکھئے جس ہم سفر کو آپ شریف آدمی سمجھ رہے ہیں، ممکن ہے جیب کترا ہو۔جس ہمسائے کو آپ پارسا سمجھتے ہیں ممکن ہے، اس کی آنکھ آپ کی بیوی پر ہو۔جس شخص کو آپ دوست تصور کرتے ہیں، ہو سکتا ہے وہ پرلے درجے کا دغا باز ہو۔

مس فراؤن: آپ کا اپنے متعلق کیا خیال ہے؟

میاں شکی: میں اپنے پر بھی اکثر شک کرتا ہوں۔بسا اوقات مجھے شک گزرتا ہے کہ میرا دماغی توازن ٹھیک نہیں۔

مس فراؤن: اس وقت تو آپ کی حالت بڑی قابلِ رحم ہوتی ہوگی۔

میاں شکی: اس میں کیا شک ہے۔

مس فراؤن: (پانچویں مسافر سے) اچھا صاحب، آپ کافی عرصہ سے خاموش بیٹھے ہیں آپ بھی کچھ فرمایئے۔

حلیم: میرا نام حلیم ہے۔

تک بند: حلیم؟ بڑا فضول سا نام ہے۔سوائے رحیم اور کریم کے کوئی قافیہ ہی نہیں۔

مس فراؤن: آپ کا شغل؟

حلیم: معلم ہوں۔لڑکوں کو پڑھاتا ہوں۔بیوی بچوں کا پیٹ پالتا ہوں۔

مس فراؤن: یہ تو آپ کا پیشہ ہوا، شغل بتایئے۔

حلیم: بس اسی کو شغل سمجھ لیجئے۔

مس فراؤن: (چمک کر) اسے آپ شغل کہتے ہیں؟

حلیم: یہ شغل نہیں تو اور کیا ہے؟

تک بند: یہ شغل نہیں، محض تضیع اوقات ہے۔

حلیم: معاف کیجئے۔ مجھے آپ سے اتفاق نہیں۔

مس فراؤن: ارے بھائی، ذرا ان کے ذہن کی داد دیجئے۔ ان کے خیال میں لڑکوں کو پڑھانا اور بیوی بچوں کا پیٹ پالنا بھی شغل ہے۔

مرزا خدشہ: (قہقہہ لگا کر) ہاہاہا۔ میاں عقل کے ناخن لو۔ لڑکوں کو پڑھانا اور بیوی بچوں کا پیٹ پالنا بھی کوئی شغل ہے۔ ہاہاہا۔ ہاہاہا۔ بھئی حد ہوگئی۔

☆☆☆

چندارے

کردار:.....

پروفیسر راکیش

بھولا: پروفیسر راکیش کا نوکر

چندا: فائن فائن۔ فائن آرٹس سوسائٹی کی سیکرٹری

نیلا مبرا اور ششی: پروفیسر راکیش کے بے تکلف دوست

مقام:..... پروفیسر راکیش کا ڈرائینگ روم۔

پروفیسر راکیش: (ایک کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے) آہاہا۔ کتنا دلچسپ مجموعہ ہے! اور پھر نام کتنا پیارا ہے۔ 'چندارے!' لطف یہ کہ یہ سب گیت چندا پر لکھے گئے ہیں۔

چندارے تو روتا کیوں ہے

چندارے تو کیوں مسکائے چندارے کیا صبح نہ ہوگی؟

چندارے تو کیوں شرمائے چندارے تو کیوں چندارے

فلمی شاعر بھی کمال کرتے ہیں۔ بخدا کیا سوال کیا ہے۔ ع چندا رے تو کیوں چندا رے، اب بھلا بے چارا چندا اس سوال کا کیا جواب دے گا۔ اور پھر یہ گیت

چندا رے اور ظالم چندا

نوکر کو آواز دیتے ہوئے بھولا۔ ارے بھولا۔

بھولا: جی سرکار

راکیش: (قریب آتے ہوئے) جی سرکار۔

راکیش: بھولا۔ کیا تم جانتے ہو کہ چندا کیوں ظالم چندا ہے۔

بھولا: سرکار اپنے دھندے سے فرصت ہی کتنی ملتی ہے کہ بندہ یہ سوچے کہ چندا کیوں ظالم ہے۔

راکیش: تم ایک دم ڈل (DULL) ہو بھولا۔ ایک دم ڈل۔ فلمی گیت سمجھنا تمہارے بس کا روگ نہیں۔ اچھا تم جاؤ۔ ہم سوچتے ہیں، آج کالج سے چھٹی ہے..... اور ہاں دوڑ کر بازار سے سگریٹ لے آؤ۔

بھولا: بہت اچھا سرکار۔ (جاتا ہے)

سورج نہیں یا شاید اس لیے کہ وہ شاعر کو ظالم نظر آتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چندا اس لیے ظالم ہے کہ شاعر کا محبوب اس سے روٹھ گیا ہے اور اسے اس کی یاد ستا رہی ہے۔ لیکن یہ بات کیا بنی۔ ع چندا رے او ظالم چندا۔

(کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے)

راکیش: کون؟

آواز: جی میں ہوں چندا

راکیش: (حیرانی سے) چندا؟ لیکن تم آسمان سے زمین پر کیسے آ گئے، خیر دروازہ کھلا ہے۔ تشریف لے آیئے۔

چندا: (کمرے میں داخل ہوتے ہوئے) نمستے۔

راکیش: نمستے۔

چندا: ''میں فائن فائن فائن آرٹس سوسائٹی کی سیکرٹری ہوں''۔

راکیش: یہ فائن فائن آرٹس سوسائٹی کیا بلا ہے؟

چندا: یہ ایک نئی سوسائٹی ہے۔ اس کا مقصد فائن آرٹس بالخصوص پینٹنگ کو فروغ دینا ہے۔ اس سوسائٹی کے جتنی ممبر ہیں، وہ پینٹنگ میں عجیب وغریب تجربے کر رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ایسی تصویریں بنائی جائیں جن کو دیکھ کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔

راکیش: خوب۔ بہت خوب! اچھا تو آپ کے پاس ایسی تصاویر ہیں جنہیں دیکھ کر.....

چندا: جی ہاں! یہ دیکھئے میرا البم! اس میں میری تازہ ترین تصاویر ہیں۔

راکیش: دکھایئے ذرا۔

چندا: (البم کھول کر ایک تصاویر دکھاتے ہوئے) یہ پہلی تصویر ملاحظہ فرمایئے۔ اس کا نام ہے۔ ''بندرا بن کی گوپی''۔

راکیش: (تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے) بندرا بن کی گوپی؟ مجھے تو گوپی وپی کہیں نظر نہیں آتی۔ یہ تو ایسا لگتا ہے کہ آپ نے ایک بڑے کاشی پھل کے اوپر ایک چھوٹا کاشی پھل رکھ کر اس کے اوپر کوئلے کے دو ٹکڑے رکھ دیئے ہیں۔

چندا: (ہنستے ہوئے) ہا ہا ہا، واہ پروفیسر صاحب۔ آپ جیسا سمجھ دار آدمی بھی دھوکا کھا گیا۔ اجی جسے آپ بڑا کاشی پھل سمجھ رہے ہیں، وہ گوپی کا پیٹ ہے اور وہ جو چھوٹا کاشی پھل ہے، وہ اس کا سر ہے اور یہ کوئلے کے دو ٹکڑے نہیں، گوپی کی چمکتی ہوئی آنکھیں ہیں۔

راکیش: یہ بات ہے۔ اچھا ذرا دوسری تصویر دیکھیں۔

چندا: ہاں یہ دوسری تصویر ہے۔ بھلا بتایئے یہ کیا ہے؟

راکیش: کچھ کہہ نہیں سکتا کہ یہ کیا ہے۔ معلوم تو یہی ہوتا ہے کہ ایک بندر ہاتھ میں خربوزہ پکڑ کر کنویں میں اترنے کی کوشش کر رہا ہے۔

چندا: واہ پروفیسر صاحب۔ خوب سمجھے، اجی یہ بندر نہیں۔ مستقبل کا انسان ہے، اس کے ہاتھ میں خربوزہ نہیں۔ ایٹم بم ہے اور وہ جو کنواں ہے۔ کنواں نہیں تباہی کا غار ہے، سمجھے آپ؟''

راکیش: سمجھا تو نہیں، لیکن چونکہ آپ ایسا کہتی ہیں اس لیے مان لیتا ہوں۔

چندا: دراصل یہ آپ کا قصور نہیں۔ یہ ہم آرٹسٹوں کا قصور ہے۔ ہم آپ کو ایسی تصاویر بہت کم تعداد میں دے رہے ہیں، اس لیے آپ انہیں سمجھنے سے قاصر ہیں۔ آپ بھی بہت سے اور لوگوں کی طرح وہی تصاویر پسند کرتے ہیں جنہیں دیکھ کر کچھ سوچنا نہ پڑے۔

راکیش: یہ تو آپ بجا فرماتی ہیں۔ اچھا یہ بتائیے کہ آپ یہاں تشریف کیسے لائیں؟ اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں ان تصاویر پر ایک آدھ مضمون لکھوں تو یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ کیونکہ جس چیز کو میں سمجھ نہیں سکتا اس کے متعلق کبھی نہیں لکھتا۔

چندا: جی نہیں، یہ بات نہیں۔ میں آپ سے اپنی سوسائٹی کے لیے چندہ لینے آئی ہوں۔

راکیش: چندہ؟

چندا: جی ہاں چندہ۔ دیکھئے ہمارے بہت سے آرٹسٹ بھوکے مر رہے ہیں۔ ایک کو پچھلے چھ ماہ سے کالی کھانسی کی شکایت ہے، ڈاکٹر کا خیال ہے کہ اسے بہت جلد دق ہو جائے گی۔ دوسرے کا دماغ چل گیا ہے، اسے پاگل خانے بھجوانا پڑے گا۔ تیسرے کی آنکھوں میں موتیا بند اتر آیا ہے، اس کا آپریشن ہوگا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ روپے کی اشد ضرورت ہے۔

راکیش: وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ کوئی شخص ان کی تصاویر خریدنا نہیں چاہتا۔

راکیش: اور خریدے بھی کیوں۔ جب کہ اس تصاویر کا سر ہے نہ پیر۔

چندا: یہ بات نہیں پروفیسر صاحب۔ دراصل لوگوں کا مذاق اتنا بگڑ چکا ہے کہ وہ ان تصاویر کی قدر نہیں کر سکتے۔ خیر یہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم کوشش کر رہے ہیں..... اچھا تو کہئے، کتنے روپے دے رہے ہیں آپ؟

راکیش: آج مہینے کی 28 تاریخ ہے اور میرے بٹوے میں صرف بیس روپے ہیں۔

چندا: (مایوسی سے) یہ تو بہت تھوڑے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ آپ جیسا آرٹ کو سمجھنے والا کم از کم چالیس روپے تو دے گا۔

راکیش: معاف کیجئے۔ نہ تو میں اس قسم کے آرٹ کو سمجھتا ہوں اور نہ ہی چالیس روپے دے سکتا ہوں۔

چندا: اچھا تو میں ہی لائیے۔

راکیش: میں آپ کو دے دوں۔ اور میں خود۔

چندا: اچھا، پانچ رکھ لیجئے۔ میرا مطلب ہے۔ سگریٹ پان وغیرہ کے لیے اور پندرہ دے دیجئے۔

راکیش: نہیں پندرہ زیادہ ہیں۔

چندا: اچھا تو چودہ دے دیجئے۔ دیکھئے چودہ سے ایک کم نہ لوں گی۔ نکالیے نکالیے میں پرچی کاٹتی ہوں۔

راکیش: (بے دلی سے) ہیں تو یہ بھی زیادہ۔ لیکن خیر لیجئے۔

(روپے دیتا ہے)

چندا: شکریہ بہت بہت شکریہ۔ فائن فائن۔ فائن آرٹس سوسائٹی آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولے گی۔ اچھا نمستے۔

راکیش: نمستے۔

(چندا جاتی ہے)

راکیش: عجیب لڑکی معلوم ہوتی ہے یہ چندا بھی۔ اب کچھ کچھ سمجھ میں آ رہا ہے کہ شاعر نے یہ کیوں کہا۔ ع چندا رے اور ظالم چندا۔ اونہہ۔ فائن فائن آرٹس سوسائٹی کتنا فضول نام ہے۔

(کوئی پھر دروازہ کھٹکھٹاتا ہے)

آواز: پروفیسر گھر پر ہیں۔

راکیش: (آواز پہچانتے ہوئے) کون نیلامبر، آؤ بھئی آؤ۔ دروازہ کھلا ہے۔

(نیلامبر اور ششی اندر آتے ہیں)

نیلامبر: ہیلو راکیش

ششی: ہیلو پروفیسر۔

راکیش: آؤ بھئی۔ بیٹھو۔

نیلامبر: نہیں ہم بیٹھیں گے نہیں۔ بس کھڑے کھڑے بات کریں گے۔

راکیش: کیوں خیر تو ہے۔

نیلامبر: ہاں خیر ہی ہے۔ششی اور ہم نے ایک نئی مہم شروع کی ہے، اس کا نام ہے ''ایٹ مور وٹامن پلیز''۔(Eat More Vitamin Please)

''مہربانی کر کے اور وٹامن کھایئے''۔تم جانتے ہو کہ آج کل مہموں کا زمانہ ہے۔ ہم نے سوچا ہے کہ ہم بھی کیوں نہ ایک مہم شروع کر دیں۔

راکیش: لیکن اس کی کیا ضرورت تھی۔ میرا تو خیال ہے لوگ پہلے ہی کافی وٹامن کھاتے ہیں۔ میرا مطلب ہے امیر لوگ۔

ششی: بالکل غلط۔ دیکھئے اگر آپ وٹامن ''اے'' کھاتے تو آپ کے چہرے کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا نہ ہوتا۔

نیلامبر: اور اگر آپ وٹامن ''سی'' کھاتے تو آپ کے دانت اتنے کمزور نہ ہوتے۔

ششی: اور اگر آپ وٹامن ''اے، بی، سی'' کھاتے تو آپ کا جسم اکہرا نہ ہوتا۔

راکیش: بھئی میرا جسم، میرا چہرہ، میرے دانت اچھے خاصے ہیں اور میرا خیال ہے کہ میں کافی وٹامن کھاتا ہوں۔

نیلامبر: نہیں نہیں بالکل نہیں۔ یہی تو آپ کی غلطی ہے۔ آپ بھی ہزاروں لوگوں کی طرح سمجھتے ہیں کہ آپ کافی وٹامن کھا رہے ہیں۔ حالانکہ آپ بہت کم وٹامن کھاتے ہیں۔ اچھا بھلا آپ نے کبھی کیلے کی چھلکے کھائے ہیں۔

راکیش: کیلے کے چھلکے؟ کیلے کے چھلکے کون کھا سکتا ہے۔

ششی: اجی پروفیسر صاحب، کھانے والے سب کھاتے ہیں۔ اچھا آپ نے کبھی شیشم کے پتے کھائے ہیں۔

راکیش: شیشم کے پتے؟ یہ تو کبھی نہیں کھائے۔ خدا وہ وقت نہ لائے کہ یہ کھانا پڑیں۔

ششی: اجی دعا کیجئے کہ خدا آپ کو عقل دے، اور بہت جلد شیشم کے پتے کھانا شروع کر دیں۔ معلوم ہے۔ شیشم کے پتوں میں کتنے وٹامن ہوتے ہیں۔

راکیش: ہوتے ہوں گے۔ لیکن میں شیشم کے پتے.....

نیلامبر: اچھا چھوڑیئے۔ آپ نے کبھی سبز گھاس کھائی؟

راکیش: گھاس؟ کیا تم مجھے جانور سمجھتے ہو؟

نیلامبر: اجی نہیں۔ سبز گھاس وٹامن ''اے'' اور ''بی'' کا سب سے بڑا مخزن ہے۔ دیکھئے، ہرن، بیل سب گھاس کھاتے ہیں اور کتنے طاقتور ہوتے ہیں۔

راکیش: گستاخی معاف۔ میں گھاس نہیں کھا سکتا۔

ششی: اوہ پروفیسر۔ ''یوڈونٹ نو وہاٹ یو آر مسنگ''۔

"You donot know what you are Missing"

نیلامبر: آپ کو کم از کم دو سیر گھاس ضرور کھانا چاہیے۔

راکیش: مجھے تو معاف ہی رکھیے۔ اچھا یہ بتایئے کہ آپ کی کیا خدمت کی جائے، سگریٹ لیمن ..... چائے؟

ششی: یہ تکلفات رہنے دیجئے۔ دیکھئے اس مہم کو ہر دل عزیز بنانے کے لیے ہمیں روپے کی ضرورت ہے۔ آپ کھلے دل سے چندہ دے کر ہماری مدد کیجئے۔

راکیش: چندہ؟ لیکن آج تو مہینے کی 28 تاریخ ہے اور میرے بٹوے میں صرف چھ روپے رہ گئے ہیں۔

ششی: کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں۔ ہمیں چھ روپے ہی دے دیجئے۔

راکیش: چھ روپے تمہیں دے دوں اور میں کیا کروں۔

نیلامبر: آپ وٹامن کھایئے۔ ہاہاہا سمجھے آپ۔

راکیش: اچھا تین روپے لیجئے۔

نیلامبر: تین روپے۔ اتنے بڑے پروفیسر سے صرف تین روپے، اتنی ضروری مہم کے لیے تین روپے۔ دیکھئے چھ سے کم نہ ہوگا۔

راکیش: اچھا بھئی ضد نہ کرو۔ پانچ لے لو۔

نیلامبر: اچھا لاؤ۔ ایک روپے کا ادھار رہا۔

راکیش: (پانچ روپے دیتے ہوئے) لیجئے۔

نیلامبر: شکریہ..... نمستے۔

ششی: نمستے۔

(نیلا مبر اور ششی جاتے ہیں)

راکیش: مہینے کی 28 تاریخ اور جیب میں صرف ایک روپیہ۔

(دروازہ کھٹ کھٹایا جاتا ہے)

راکیش: (اونچی آواز سے) اگر آپ بھی چندہ لینے آئے ہیں تو سمجھ لیجئے کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔

(کھٹ کھٹ کی آواز)

راکیش: کون ہے بھئی۔

بھولا: جی میں ہوں، بھولا سگریٹ لایا ہوں۔

راکیش: اوہ بھولا..... میں تو ڈر ہی گیا تھا۔ (بھولا سے) میں سمجھا کہ تم بھی چندہ ہو!

بھولا: چندا؟ کون چندا؟ کہیں وہی تو نہیں جس کے متعلق آپ مجھ سے پوچھ رہے تھے؟

راکیش: نہیں نہیں۔ یہ دوسرا چندہ ہے۔ اس چندہ نے تو آج کمر ہی توڑ کر رکھ دی ہے۔

بھولا: کیا مطلب سرکار؟

راکیش: کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔ اچھا کوئی مجھ سے ملنے آئے تو اسے اندر مت آنے دینا۔

اسے کیا کہوں سرکار؟

راکیش: اسے کہو کہ جب سے چندا آسمان سے اڑ کر زمین پر آ گیا ہے، صاحب چندہ سے گھبرا کر پاتال میں چلے گئے ہیں۔

بھولا: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سرکار؟

راکیش: بھولا تم نہیں جانتے۔ چند کتنا ظالم ہوتا ہے۔

بھولا: صاحب۔ میں ایک دم ڈل ہوں۔ چندہ کو سمجھنا میرے بس کا روگ نہیں۔

اچھا تو ملاقاتیوں سے کیا کہہ دوں۔

راکیش: وہی جو میں نے کہا ہے۔

بھولا: بہت اچھا سرکار، بہت اچھا۔

☆☆☆

مجھے میرے بزرگوں سے بچاؤ!

میں ایک چھوٹا سا لڑکا ہوں۔ ایک بہت بڑے گھر میں رہتا ہوں، دراصل رہتا کہاں ہوں، زندگی کے دن کاٹتا ہوں۔ چونکہ سب سے چھوٹا ہوں، اس لیے گھر میں سب میرے بزرگ کہلاتے ہیں۔ یہ سب مجھ سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔ انہیں چاہے اپنی صحت کا خیال رہے نہ رہے، میری صحت کا خیال ضرور ستاتا رہتا ہے۔ دادا جی ہی کو لیجئے۔ یہ مجھے گھر سے باہر نکلنے ہی نہیں دیتے کیونکہ باہر گرمی یا برف پڑ رہی ہے، بارش ہو رہی ہے یا درختوں کے پتے جھڑ رہے ہیں۔ کیا معلوم کوئی پتا میرے سر پر تڑاخ سے لگے اور میری کھوپڑی پھوٹ جائے۔ ان کے خیال میں گھر اچھا خاصا قید خانہ ہونا چاہیے۔ ان کا بس چلے تو ہر ایک گھر کو جس میں بچے رہتے ہیں، سینٹرل جیل میں تبدیل کر کے رکھ دیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ بچوں کو بزرگوں کی خدمت کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر وقت مجھ سے چلم بھرواتے یا پاؤں دبواتے رہتے ہیں۔

دادی جی بہت اچھی ہیں۔ پوپلا منہ۔ چہرے پر بے شمار جھریاں، اور خیالات بے حد پرانے یہ ہر وقت مجھے بھوتوں، جنوں اور چڑیلوں کی باتیں سنا سنا کر ڈراتی رہتی ہیں۔ دیکھو بیٹا۔ مندر کے پاس جو پیپل ہے، اس کے پیچھے مت کھلینا۔ اس کے اوپر ایک بھوت رہتا ہے۔ آج سے پچاس برس پہلے جب، ابھی میری شادی نہیں ہوئی تھی، میں اپنی سہیلی کے ساتھ اس پیپل کی چھاؤں میں کھیل رہی تھی کہ یک لخت میری سہیلی بے ہوش ہو گئی۔ جب اسے ہوش آیا تو اس نے چیخ کر کہا۔ ''بھوت'' اور وہ پھر بے ہوش ہو گئی۔ اس طرح وہ سات دفعہ ہوش میں آئی اور سات دفعہ بے ہوش ہوئی۔ اسے گھر پہنچایا گیا۔ جہاں وہ سات دن کے بعد مر گئی۔ اور ہاں جو پرانی سرائے میں کنواں ہے، اس کے نزدیک مت پھٹکنا، اس میں ایک چڑیل رہتی ہے۔ وہ بچوں کا کلیجہ نکال کر کھا جاتی ہے۔ اس چڑیل کی یہی خوراک ہے۔''

پتا جی کا تکیۂ کلام ہے ''نالائق'' ایک اور تکیۂ کلام ہے۔ ''جب میں طالب علم تھا''۔ وہ جب بھی مجھ سے گفتگو کرتے ہیں۔ ان دونوں میں سے ایک تکیۂ کلام ضرور استعمال کرتے ہیں۔

''آج کتنے سوال نکالے؟''

''جی دس''۔

''صرف دس۔ نالائق''۔

''آج تاریخ کے کتنے صفحے پڑھے؟''

''جی بیس''۔

''نالائق۔ جب میں طالب علم تھا، پچاس صفحے پڑھا کرتا تھا''۔

''اکبر کون تھا''۔

''جی ایک بادشاہ تھا۔

''نالائق۔ کہو ایک بہت اچھا بادشاہ تھا''۔

''امتحان میں کیسے رہے''۔

''جی امتحان میں تیسرا رہا ہوں''۔

''نالائق۔ جب میں طالب علم تھا، ہمیشہ اول آیا کرتا تھا''۔

''آج کتنی روٹیاں کھائیں''۔

''جی تین''۔

''نالائق، جب میں طالب علم تھا، دس روٹیاں کھالیا کرتا تھا''۔

ماتا جی کو ہر وقت یہ خدشہ لگا رہتا ہے کہ پرماتمانہ کرے اگر مجھے کچھ ہو گیا، تو پھر کیا ہوگا۔ وہ مجھے تالاب میں تیرنے کے لیے اس لیے نہیں جانے دیتیں کہ اگر میں ڈوب گیا تو؟ آتش بازی کے اناروں، پٹاخوں اور پھلجھڑیوں سے اس لیے کھیلنے نہیں دیتیں کہ اگر میرے کپڑوں میں آگ لگ گئی تو؟ پچھلے دنوں میں کرکٹ کھیلنا چاہتا تھا۔ ماتا جی کو پتا لگ گیا۔ کہنے لگیں کرکٹ مت کھیلنا۔ بڑا خطرناک کھیل ہے۔ پرماتمانہ کرے اگر گیند آنکھ پر لگ گئی تو؟''

بڑے بھائی صاحب کا خیال ہے کہ جو چیز بڑوں کے لیے بے ضرر ہے، چھوٹوں کے لیے سخت مضر ہے۔ خود چوبیس گھنٹے پان کھاتے ہیں لیکن اگر مجھے کبھی پان کھاتے ہوئے دیکھ لیں تو فوراً ناک بھوں چڑھا کر کہیں گے۔ ''پان نہیں کھانا چاہیے۔ بہت گندی عادت ہے''۔ سینما دیکھنے کے بہت شوقین ہیں لیکن میں اگر ساتھ جانے پر اصرار کروں تو کہیں گے۔ ''چھوٹوں کو فلمیں نہیں دیکھنا چاہئیں اخلاق پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔''

اسی طرح چھوٹوں کو عطر نہیں لگانا چاہیے تاکہ ان کے کپڑوں سے خوشبو نہ آئے، نظمیر نہیں

لکھنا چاہئیں تا کہ وہ بڑے ہو کر شاعر نہ بن جائیں، ہنسنا نہیں چاہیے تا کہ وہ ہمیشہ اداس رہیں۔

اب رہیں ہماری بھابی۔ انہیں افسانے لکھنے اور جاسوسی ناول پڑھنے کا شوق ہے۔ ان کا تکیہ کلام ہے۔ ''لپک کے جائیو، جب بھی میں کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹتا ہوں وہ کہتی ہیں۔ ''لپک کے جائیو اور دل پسند بک سٹال سے رسالہ ''سورج مکھی'' کا تازہ نمبر لے آئیو۔ اگر ''سورج مکھی'' نہ ملے تو ''چندر مکھی'' لے آنا۔ اگر وہ بھی نہ ہو تو ''تارا مکھی'' اور ہاں پوچھتے آنا کہ ''چالاک چور'' کا دوسرا حصہ چھپ کر آ گیا یا نہیں۔ اور ''پھر تیلا ڈاکو'' کب تک چھپ رہا ہے۔'' سارا دن ایک بک سٹال سے دوسرے بک سٹال تک مارا مارا پھرتا ہوں۔ کبھی ''نقاب پوش'' حصہ اول کی تلاش میں کبھی ''پراسرار قلعہ حصہ'' دوئم کی کھوج میں۔

بڑی بہن کو گانے بجانے کا شوق ہے۔ ان کی فرمائشیں اس قسم کی ہوتی ہیں۔ ''ہارمونیم پھر خراب ہو گیا ہے۔ اسے ٹھیک کرا لاؤ۔ ستار کے دو تار ٹوٹ گئے ہیں، اس لیے میوزیکل ہاؤس لے جاؤ۔ طبلہ بڑی خوفناک آوازیں نکالنے لگا ہے، اسے فلاں دوکان پر چھوڑ آؤ۔'' جب انہیں کوئی کام لینا ہو تو بڑی میٹھی بن جاتی ہیں۔ کام نہ ہو تو کاٹنے کو دوڑتی ہیں۔ خاص کر جب ان کی سہیلیاں آتی ہیں اور وہ طرح طرح کی فضول باتیں بناتی ہیں، اس وقت میں انہیں زہر لگنے لگتا ہوں۔

لے دے کے سارے گھر میں ایک غم گسار ہے۔ اور وہ ہے میرا کتا ''موتی''۔ بڑا شریف جانور ہے۔ وہ نہ تو بھوتوں اور چڑیلوں کے قصے سنا کر مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش کرتا ہے نہ مجھے نالائق کہہ کر میری حوصلہ شکنی کرتا ہے اور نہ اسے جاسوسی ناول پڑھنے کا شوق ہے نہ ستار بجانے کا۔ بس ذرا موج میں آئے تو تھوڑا سا بھونک لیتا ہے۔ جب اپنے بزرگوں سے تنگ آ جاتا ہوں تو اسے ساتھ لے کر جنگل میں نکل جاتا ہوں۔ وہاں ہم دونوں تیتریوں کے پیچھے بھاگتے ہیں گلہریوں کا تعاقب کرتے ہیں، چشمے میں ناچتی ہوئی مچھلیوں کو دیکھتے ہیں۔ دادا جی اور دادی جی سے دور، پتا جی اور ماتا جی سے دور۔ بھابی اور بہن کی دسترس سے دور۔ اور کبھی کبھی درخت کی گھنی چھاؤں میں موتی کے ساتھ سستاتے ہوئے میں سوچنے لگتا ہوں۔ کاش! میرے بزرگ سمجھ سکتے کہ میں بھی انسان ہوں۔ یا کاش وہ اتنی جلدی بھول نہ جاتے کہ وہ بھی میری طرح ایک چھوٹا سا لڑکا ہوا کرتے تھے۔

☆☆☆

تقریبوں میں شرکت

فکر معاش، عشق بتاں، یاد رفتگاں،
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے

بہت خوب! لیکن شاعر تقریبوں میں شرکت کرنے کو کیوں فراموش کر گیا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ شاید اس لیے کہ فکر معاش وغیرہ شدید قسم کے دردسر ہیں اور تقریبوں میں شرکت ہلکے قسم کا دردسر ہے یا شاید اس لیے کہ شاعر ان خوش قسمت اشخاص میں سے تھا جنہیں دعوتی رقعے بھجوائے نہیں جاتے، ورنہ یہ تو ممکن نہیں کہ وہ تین قسم کے دردِ سر تو شعر میں گنوا دے اور چوتھے کا ذکر ہی نہ کرے۔

کہتے ہیں انسان سوشل قسم کا جانور ہے۔ یہ بات اکثر نہایت فخر سے دہرائی جاتی ہے حالانکہ بے چارے انسان کی بدقسمتی یہی ہے کہ وہ بہتر قسم کا جانور نہیں اور سوسائٹی میں رہتے ہوئے اس کا سوشل تقاریب سے دامن چھڑانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔

آپ کتنے ہی مصروف کیوں نہ ہوں، حیلہ جو کیوں نہ ہوں اور آپ کو تقاریب سے کتنی ہی چڑ کیوں نہ ہو، آپ کو تقریبوں میں شرکت کرتے ہی بنے گی، نہیں تو احباب روٹھ جائیں گے۔ رشتہ دار کہیں گے کہ آپ کا دماغ چل گیا ہے اور برادری آپ کا حقہ پانی بند کر دے گی۔ اب کس میں اتنی ہمت ہے کہ بیک وقت تین خطرے مول لے سکے۔ اسی لیے تو ہم نے کہا نا کہ خیریت اسی میں ہے کہ تقریبوں میں شرکت کی جائے۔

فراغت کے لمحوں میں ہم نے کئی بات حساب لگا کر دیکھا ہے کہ کسی تقریب میں شرکت کرنے کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ یعنی وہ کسی بھاؤ پڑتی ہے اور ہمیشہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جوا کبر الہ آبادی نے فرمایا:

کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جا کر

بالکل غلط فرمایا، کیونکہ تقاریب اتنی مہلت ہی کب دیتی ہیں کہ آدمی ہوٹلوں کا رخ کر سکے۔ دراصل انہیں یوں کہنا چاہیے تھا کہ عمرِ عزیز تقاریب میں کٹی اور مرے بھی اس لیے کہ ایک تقریب کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری میں شریک ہوتے رہے۔

آپ ہماری ہی مثال لیجئے، ہم ذرا خلوت پسند واقع ہوئے ہیں۔ یہ بات تو نہیں کہ ہم دنیا کی محفلوں سے تنگ آ گئے ہیں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ جب تک اہلِ محفل اپنے مزاج اور اپنی پسند کے نہ ہوں، ہمیں محفلوں سے دور رہنے ہی میں سلامتی نظر آتی ہے۔ لیکن اس کا اب کیا کیا جائے کہ آئے دن ہمیں ایسی تقریبوں میں مدعو کیا جاتا ہے جہاں چراغ لے کر بھی ڈھونڈیں تو ع

ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زبان کوئی نہ ہو

ابھی چند دن ہوئے ہمارے ہمسائے کے لڑکے کا منڈن تھا۔ ہمارے ہمسائے خالص قسم کے بیوپاری آدمی ہیں۔ شعر و ادب سے انہیں دور کا بھی واسطہ نہیں لیکن ان کا تقاضا تھا کہ ہم منڈن کے موقع پر ضرور آئیں۔ جب ان کا دعوتی کارڈ ملا اور پڑھا تو گویا ہوش اڑ گئے۔ لالہ جی نے منڈن کے لیے اتوار کا دن اور نو بجے صبح کا وقت مقرر کیا تھا۔ خدا خدا کر کے سات دنوں کے بعد اتوار کی شکل دیکھنا نصیب ہوتا ہے اور وہ بھی اگر منڈن کی نذر ہو جائے، تو اتوار کا سارا مزا کرکرا ہو جاتا ہے۔ سوچا تو یہ تھا کہ اس اتوار کو امجد صاحب سے ملیں گے، کچھ سنیں سنائیں گے، گپ شپ رہے گی، چائے کے دو ایک دور ہو جائیں گے اور پھر اگر موڈ اچھا ہوا تو کسی ہوٹل میں کھانا کھانے کے بعد سیدھے کسی سینما ہال کا رخ کریں گے۔ لیکن اس منڈن نے سارے پروگرام پر پانی پھیر دیا۔ بقول فلمی شاعر ع

سوچتا تھا کیا، کیا ہو گیا

بادلِ نخواستہ ٹھیک نو بجے لالہ جی کے گھر پہنچے وہاں جا کر دیکھا۔ ع

عجب تھی بہار اور عجب سیر تھی

یعنی لالہ جی اور ان کے تین چار ملازموں کے علاوہ اور کوئی نظر نہیں آیا۔ لالہ جی نے ہم سے مصافحہ کرتے ہوئے فرمایا۔ آپ ذرا جلدی آ گئے۔ خیر کوئی بات نہیں تشریف رکھیے۔

ہم نے کہا ''وقت تو نو بجے ہی تھا نا؟''

''جی ہاں! جی ہاں، لیکن آپ جانتے ہیں تو بجے کا مطلب نو بجے تو نہیں ہوتا''۔

ہم نے دل میں یہی سمجھا کہ نو بجے کا مطلب شاید گیارہ بجے ہوتا ہے اور ہم وقت مقررہ سے دو گھنٹے پہلے چلے آئے ہیں۔ ہمیں ایک کرسی پر بیٹھا کر لالہ جی اپنے ملازموں سے خطاب کرنے لگے۔

''ہاں تو نائی کا بندوبست ہو گیا''۔

''جی ہاں''۔

''اور پنڈت جی؟''۔

''وہ بھی دس بجے پہنچ جائیں گے''۔

''اور لڈو؟''۔

''بس تیار ہی سمجھئے''۔

''لاؤڈ اسپیکر؟''۔

''وہ بھی آ رہا ہے''۔

کوئی ساڑھے نو پونے دس بجے مہمان آنا شروع ہوئے۔ اب جو دیکھتے ہیں کہ ایک سے ایک بڑھ کر بیوپاری اپنی اپنی نشست پر بیٹھتے ہی انہوں نے جو تاجرانہ قسم کی گفتگو شروع کی تو ہمارے پلے کچھ نہ پڑا کہ یہ کیا قصے ہو رہے ہیں۔ ایک بزرگ نے دوسرے بزرگ کا شانہ جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

''تازہ رپورٹ کیا ہے''۔

اس کے جواب میں دوسرے بزرگ نے فرمایا۔

''پونے بارہ آنے..... پونے بارہ آنے؟ ایک بزرگ نے چونک کر کہا:۔ نہیں جی ساڑھے گیارہ آنے'' اچھا تو پھر کیا خیال ہے آپ کا؟'' کسی اور نے پوچھا۔

''اوپر جائے گا''۔

''ہاں ابھی رہنے ہی دیجئے''۔

آدھ گھنٹے کے قریب وہ اسی انداز میں پہیلیاں کہتے رہے اور خدا جانے کب تک کہتے رہتے اگر لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے سنوائے جانے والے فلمی ریکارڈوں میں ان کی آواز دب کر نہ رہ جاتی۔

دس بجے منڈن کی رسم شروع ہوئی۔ رسم کے دوران میں کئی بار محسوس ہوا کہ یہ کبھی ختم ہونے کا نام نہ لے گی۔ سوا گیارہ بجے پنڈت جی نے یہ مژدہ سنایا کہ منڈن کی رسم ختم ہو چکی ہے۔ اب تین چار بھجن ہوں گے۔ اس کے بعد بچے کو اشیرواد دی جائے گی۔ پھر لڈو تقسیم ہوں گے، اس کے بعد مہمان اگر چاہیں تشریف لے جا سکتے ہیں۔

ساڑھے گیارہ بجے گھر لوٹے۔ متواتر اڑھائی گھنٹے بیٹھ کر اتنے تھک گئے کہ محسوس ہوا منڈن سے نہیں کسی لمبے سفر سے لوٹے ہیں۔ یہ تو تھی منڈن کی تقریب جسے عام طور پر نہایت ادنیٰ قسم کی تقریب کہا جاتا ہے۔ اب ایک اعلیٰ قسم کی تقریب کا بھی قصہ سن لیجئے ہم آرام سے بستر پر لیٹے ہوئے تھے کہ ڈاکیہ نے ایک دعوتی کارڈ لا کر دیا، لکھا تھا:۔

''عزیز من''۔

''عزیز منوہر کی شادی خانہ آبادی مورخہ 23 جون کو مقرر ہوئی ہے۔ بارات بذریعہ لاری ''الٹے نگر'' جائے گی۔ آپ کی شرکت از حد ضروری ہے۔ لہٰذا آپ تاریخ مقررہ پر معہ عزیزان تشریف لا کر مجھے ممنون ہونے کا موقع دیجئے۔ اگر آپ نہ آئے تو میں سخت ناراض ہوں گا''۔

یہ خط ہماری اہلیہ کے ماموں صاحب کا ہے اور اگر ہم ان کے ہاں نہ گئے تو وہ ناراض ہوں گے اور اہلیہ محترمہ بھی ہمیں عمر بھر معاف نہ کریں گی۔ اب اس تقریب میں شرکت کرنے کا مطلب ہے چار نہایت پریشان کن مسائل سے نکر لینا۔ پہلا مسئلہ تو اخراجات کا ہے۔ یعنی بیاہ کے موقع پر پہننے کے لیے دو ایک نئے سوٹ سلوائے جائیں۔ دوسرا چھٹی کا ہے، یعنی افسر کی منت سماجت کی جائے کہ وہ چار پانچ دن کی چھٹی دینے کے لیے آمادہ ہو جائے، تیسرا قیامت کی گرمی میں سفر کرنا ہے اور چوتھا مسئلہ ہے۔ ''الٹے نگر'' جیسے قصبے کی زیارت کا۔ دل ہی دل میں ماموں صاحب کے حسنِ انتخاب کی داد دے رہے ہیں کہ لڑکے کے بیاہ کے لیے دن بھی منتخب کیا تو 23 جون یعنی موسم گرما کا سب سے لمبا دن اور بارات لے جا رہے ہیں ''الٹے نگر''۔ خیر کسی نہ کسی طرح چھٹی لے کر ان کے ہاں پہنچے۔ جون کی جھلسی ہوئی دوپہر کو بارات روانہ ہوئی۔ لاری میں پچیس آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے لیکن بچے جوان اور بوڑھے ملا کر چالیس کو ٹھونس دیا گیا ہے۔ گرمی سے جان نکلی جا رہی ہے۔ خدا خدا کر کے لاری الٹے نگر پہنچی۔

بارات کو ایک خستہ حال سرائے میں ٹھہرایا گیا۔ دن میں مکھیوں اور رات کو مچھروں نے ایک منٹ آرام نہ کرنے دیا۔ اس پر ستم یہ کہ ''ملنی'' کے موقع پر ماموں جان نے یہ فرمائش کر دی کہ عزیز منوہر لال کا سہرا جو انہوں نے کس تک بند سے لکھوایا تھا، ہم ترنم کے ساتھ حاضرین کو پڑھ کر سنائیں۔ اب ذرا سہرے کے دو تین اشعار ملاحظہ فرمائیے کہ ترنم تو ترنم اسے کوئی ذی ہوش انسان ویسے بھی پڑھنا گوارا نہ کرے گا۔

چاند نے دیکھ کے دولہے کو ستارے سے کہا
ہائے کس شان سے ہے باندھ کے آیا سہرا
دوڑ کر باپ نے سہرے کی بلائیں لے لیں
بھاگ کر ماں نے کلیجے سے لگایا سہرا
ساس یہ کہتی ہے ہمسائی سے گھبرانا نہیں
دیکھ لیجو کہ ابھی آیا کہ آیا سہرا

براتی، خراب گھی میں اناڑی ہاتھوں سے تلی ہوئی پوریاں، کچوریاں اور پکوان کھا کھا کر بے حال ہو گئے اور گلا بیٹھ گیا۔ ہاضمہ کچھ اس طرح بگڑا کہ بیاہ کے دس دن بعد میں ٹھیک ہونے میں نہ آیا۔ اتنی کوفت اٹھائی اور صلہ یہ ملا کہ ماموں صاحب سے سعادت مندی اور اہلیہ محترمہ سے فرمانبرداری کا سرٹیفکیٹ مل گیا، اب اس سرٹیفکیٹ کو چاہے شہد لگا کر چاہیے چاہے یونہی چاٹ لیجیے۔

منڈن اور شادی کی تقریبوں کے علاوہ اور درجنوں چھوٹی بڑی تقریبیں ہوتی ہیں۔ جیسے ایک ''گرہ پردیش''، یعنی نئے گھر میں پہلی بار داخل ہونا۔ اس تقریب سے زیادہ مضحکہ خیز تقریب شاید ہی کوئی ہو گی، آپ نے روپیہ بچا کر یا قرض لے کر مکان بنا لیا۔ چلو اچھا کیا۔ اب آرام سے اس میں داخل ہو جایئے۔ آخر مکان میں داخل ہونا اور وہ بھی اپنے مکان میں کون سا ایسا مرحلہ ہے جسے آپ دوسروں کی مدد کے بغیر طے نہیں کر سکتے۔

ایک اور تقریب ہے کسی کی آمد یا روانگی کے موقع پر دوست احباب کو مدعو کرنا۔ کسی کا کوئی عزیز افریقہ سے پندرہ برس کے بعد لوٹا، اب ان کا اصرار ہے کہ سو ڈیڑھ سو حضرات ان کے دولت خانے پر تشریف لائیں اور عزیز مذکور کا خیر مقدم کریں۔ کسی کا کوئی عزیز شنگھائی یا سنگاپور جا رہا ہے، لیکن وہ تب تک نہیں جا سکتا جب تک اپنا وقت ضائع کر کے اسے الوداع نہ کہیں اور پھر دوسری تقریبیں ہیں آج ہولی ہے، کل بیسا کھی ہے، پرسوں راکھی ہے۔ اس کے بعد ایک بزرگ کا چوتھا ہے۔ پھر کسی اور بزرگ کی کریا ہے، یعنی ہفتہ کا کوئی دن ایسا نہیں جب آپ اپنا پروگرام مرتب کر سکیں۔

بارہا جب متعدد دعوتی کارڈ اکٹھے ہو گئے تو جی میں آیا کہ ان سب کو معذرت کے طور پر یہ شعر لکھ بھیجیں۔

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

یا اس شعر کے بجائے علامہ شبلی کا وہ قطعہ بھجوا دیں جو انہوں نے اکبر الہ آبادی کے دعوت نامہ کے جواب میں بھجوایا تھا۔

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال
لیکن حالات کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں
دل کے بہلانے کی باتیں ہیں وگرنہ شبلی!
زندہ درگور ہوں، مرحوم ہوں مغفور ہوں میں

☆☆☆

مسٹر ڈالر

مسٹر ڈالر سے میری ملاقات ایک بین الاقوامی میلے میں ہوئی۔ اس میلے میں دنیا کے تمام بڑے بڑے ملکوں کے مداریوں، شعبدہ بازوں اور جادوگروں نے شرکت کی اور اپنے اپنے کمالات دکھائے۔

سب سے پہلے ہندوستانی مداری سٹیج پر آیا۔ گاندھی ٹوپی پہنے، سفید کھدر میں ملبوس اس نے اپنی جواہر جیکٹ کی جیب سے ایک کوئلہ نکالا اور حاضرین کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ''حضرات! آپ اچھی طرح تسلیم کر سکتے ہیں کہ یہ کوئلہ ہی ہے، چاکلیٹ نہیں۔ اس نے کوئلہ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھا۔ مٹھی بند کی، اور تین دفعہ یہ منتر پڑھا۔

چل کالی کلکتے والی کر دے سب کو اندھا

جب اس نے مٹھی کھولی تو لوگوں نے دیکھا کہ اس کی ہتھیلی پر کوئلے کے بجائے ایک چمکتا دمکتا ہیرا رکھا ہوا ہے۔ کسی نے اسے ''کوہ نور'' سمجھا، کسی نے ''کوہ طور''۔ شائقین نے اسے خریدنے کے لیے بڑی بے تابی کا اظہار کیا۔ ایک سے ایک بڑھ کر بولی دی گئی۔ لیکن ہندوستانی مداری نے مسکراتے ہوئے اسے اپنی جیب میں ڈال لیا اور کہا:۔

''حضرات! معاف کیجئے۔ یہ اصلی نہیں نقلی ہے'' ہندوستانی مداری تو رخصت ہوا۔ اب

ایرانی بابا ایک عجیب انداز سے سٹیج پر نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک بہت بڑا مٹکا تھا جسے اس نے اوندھا کر کے دکھایا کہ وہ خالی ہے، پھر مٹکے کو سیدھا کر کے اس نے سٹیج پر رکھ دیا اور نہایت پراسرار آواز میں عمر خیام کی پہلی رباعی پڑھی:۔

اٹھ جاگ کہ شب کے ساغر میں سورج نے وہ پتھر مارا ہے
جو مے تھی وہ سب بہہ نکلی جو جام تھا پارا پارا ہے،
مشرق کا شکاری اٹھا ہے، کرنوں کی کمندیں پھینکی ہیں،
اک ہاتھ میں قصر اسکندر، اک ہاتھ میں قصر دارا ہے،

اس کے بعد اس نے سات دفعہ ''ابادان'' ''ابادان'' کا وظیفہ پڑھا، حاضرین کے دیکھتے دیکھتے وہ خالی مٹکا تیل سے لبالب بھر گیا۔ تھوڑا سا تیل چھلک کر سٹیج پر بھی بہنے لگا۔ حاضرین نے خوش ہو کر تالیاں پیٹتے ہوئے کہا۔ ''تیل ایران کا بیش بہا تیل''۔ کئی لوگ مٹکے کی جانب لپکے۔ مگر ایرانی بابا نے بڑی پھرتی سے مٹکا اپنے کندھوں پر اٹھایا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا سٹیج سے اتر کر چلا گیا۔

اب سٹیج پر ایک چینی جادوگر دکھائی دیا۔ ڈاڑھی مونچھ صفاچٹ، نیلی بش شرٹ اور پتلون میں ملبوس۔ بلا کا پھرتیلا اور چاق و چوبند۔ اس نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ساتھیو! میں آپ کو ''تبدیلی ہیئت'' کا مشہور و معروف کھیل دکھاؤں گا۔ آپ حضرات میرے چہرے کی طرف غور سے دیکھتے رہیے''۔ اس نے پنجم میں ''ماؤ ماؤ'' کہنا شروع کیا۔ سامعین میں سے اکثر نے یہی سمجھا کہ وہ میاؤں کی آواز نکال کر بلی بننے کی کوشش کر رہا ہے۔

لیکن ان کی حیرانی کی حد نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ منگولین نسل کا یہ نمائندہ خالص آرین نسل کے فرد میں تبدیل ہو گیا ہے اور اس کے خدوخال خطرناک حد تک روسیوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ حاضرین کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ تبدیلی کس طرح واقع ہوئی۔ لیکن، پھر بھی انہوں نے تالیاں پیٹنا اپنا فرض سمجھا۔

اب روسی ساحر کی باری تھی۔ ایک ہاتھ میں ہتھوڑا اور دوسرے میں درانتی پکڑے جھومتا جھامتا وہ سٹیج پر آیا۔ چھ فٹ قد، پروقار چہرہ۔ مونچھوں پر عجیب قسم کا تاؤ۔ ''جے اسٹالن'' کہہ کر جو اس نے درانتی ہوا میں لہرائی تو ایک دم سٹیج پر کتنی قسم کی فصلیں لہلہانی لگیں۔ گندم، کپاس گنا۔

حاضرین میں سے کسی نے کہا۔ ''میاں کوئی جادو کا کھیل دکھاؤ۔ یہ کیا کہ لگے فصلیں کاشت کرنے!''

''جادو کا کھیل؟'' روسی نے کہا۔ ''یہ کیا کم جادو ہے کہ میں نے بنجر سٹیج سے گندم کپاس وغیرہ اگا کر رکھ دی''۔

''یہ تو کوئی بھی کسان کر سکتا ہے۔'' کسی دوسرے نے پھبتی کسی۔

''اچھا صاحب تو دیکھئے جادو کا کھیل۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی ٹوپی ہوا میں اچھالی۔ ایک چھوٹی سی فاختہ پھر پھر کرتی، ٹوپی سے نکلی اور سٹیج کے چکر کاٹنے لگی۔ یک لخت سٹیج کی روشنیاں تیز ہو گئیں۔ آسمان سے پھولوں کی بارش ہونے لگی اور پس منظر میں کوئی آرکیسٹرا خود بخود مدھم سروں میں روس کا قومی ترانہ بجانے لگا۔ حاضرین نے خوش ہو کر بڑی جوش سے تالیاں بجائیں اور روسی ساحر ''جے اسٹالن'' کا نعرہ لگا کر سٹیج سے اتر کر چلا گیا۔

اب ایک انگریز شعبدہ باز اپنے کمالات دکھانے آیا۔ اس نے اپنے بڑے کوٹ کی جیب سے ایک بلی نکالی۔ دوسری جیب سے دوسری بلی، تیسری جیب سے ایک بندر اور چوتھی جیب سے ترازو۔ پھر بندر کے ساتھ میں ترازو تھماتے ہوئے اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''ہاں بیٹا، ذرا ہوشیاری ہے''۔

حاضرین فوراً تاڑ گئے کہ وہ کیا کھیل دکھانے والا ہے۔ انہوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ یہ تو بہت پرانا کھیل ہے۔ ہم اسے ہرگز نہیں دیکھیں گے۔

انگریز شعبدہ باز نے مسکرا کر جواب دیا۔ معاف کیجئے حضرات! میرے پاس صرف یہی ایک کھیل ہے۔ اگر آپ اسے دیکھنا نہیں چاہتے تو میں معذور ہوں۔ اور وہ بلیاں، بندر اور ترازو اپنی جیبوں میں ڈال کر چلا گیا۔

زاں بعد کئی جادوگروں نے اپنے اپنے کھیل دکھائے۔ ایک پٹھان مداری نے ایک بوڑھے آدمی کی ریش سے ایک ابلا ہوا انڈہ نکالا جسے وہ سٹیج پر ہی چھیل کر کھا گیا۔ ایک مصری جادوگر نے حکم کے بادشاہ کو حکم کے غلام میں تبدیل کر کے دکھایا۔ ایک اطالوی مداری نے کیمرہ کے بغیر حاضرین کی فوٹو اتار کر رکھ دی، علیٰ ہذا القیاس۔

جب سب جادوگر اور شعبدہ باز اپنے اپنے کھیل دکھا چکے تو سٹیج سے اعلان کیا گیا کہ اب

جادوگروں کے بادشاہ مسٹر ڈالر تشریف لا رہے ہیں، حاضرین تالیاں پیٹنے لگے اور اس وقت تک پیٹتے رہے جب تک مسٹر ڈالر بہ نفس نفیس سٹیج پر تشریف نہ لے آئے۔

''حضرات! حضرات!!!'' مسٹر ڈالر نے مائیک کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔ ''میں معمولی جادوگر ہوں نہ معمولی شعبدہ باز۔ میں دراصل بیسویں صدی کا سب سے بڑا شعبدہ ہوں۔ اور میں کھیل نہیں شعبدہ دکھاتا ہوں۔ اگر آپ مجھ سے یہ توقع کرتے ہیں کہ میں عام مداریوں کی طرح بڑے بوڑھوں کی ہی ڈاڑھیوں سے انڈے نکال کر دکھاؤں یا پان کی بیگم کو اینٹ کی بیگم میں تبدیل کر دوں تو آپ غلطی پر ہیں اور یہ میری توہین ہے۔ نہ صرف میری بلکہ اس کے جادو یعنی میجک یعنی بلیک آرٹ کی بھی توہین ہے جس کا باقاعدہ مطالعہ میں نے امریکہ کی سب سے بڑی یونیورسٹی میں متواتر سولہ سال کیا۔ حضرات! جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا۔ میں شعبدے دکھاتا ہوں، شعبدے اس رعایت سے آپ مجھے شعبدہ گر یا شعبدہ باز کہہ سکتے ہیں۔ قسم ہے ریناہیورتھ کی خوبصورت ناک کی اگر چاہوں تو بہتے پانی کو روک دوں، بحرالکاہل کو چیر کر دکھا دوں، کوہ ہمالہ کو دریائے مسسپی بنا دوں، لیکن حضرات! آج میں آپ کو خطرناک قسم کے شعبدے نہیں دکھاؤں گا۔ مبادا آپ ڈر کر بے ہوش ہو جائیں۔ آج کی خدمت میں چند دلچسپ شعبدے دکھانے کا ارادہ ہے۔ تو صاحبان! غور سے دیکھئے۔ شروع کرتا ہوں''۔

مسٹر ڈالر نے اپنی بش شرٹ کا بٹن دبایا۔ فوراً ایک چمکتا ہوا سونے کا سکہ کھنکھنا کر سٹیج پر گرا۔ اس کے بعد جوں جوں وہ بٹن دباتا گیا۔ سٹیج پر سکوں کا انبار لگتا گیا۔ ایک سکہ اٹھا کر مسٹر ڈالر نے کہا۔ حضرات! فوراً اس سکے کو پہنچائیے یہ معمولی سکہ نہیں جادو کا سکہ ہے۔ اس میں یہ کمال ہے کہ جب میں یہ کسی شخص کی جیب میں ڈال دیتا ہوں تو وہ شخص انسان نہیں رہتا، الو بن جاتا ہے۔ ہاہاہا! الو!''

''الو!'' حاضرین میں سے کسی نے یوں کہا جیسے اسے مسٹر ڈالر کی بات پر یقین نہ آ رہا ہو''۔

''جی ہاں، الو، کاٹھ کا نہیں بلکہ گوشت پوست کا الو''۔

''لیکن کیسے؟ حاضرین میں سے کسی نے سوال کیا''۔

''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا''۔ مسٹر ڈالر نے مسکرا کر کہا۔ آپ حضرات میں کوئی تین اصحاب، چاہے وہ کسی ملک کے باشندے ہوں، سٹیج پر تشریف لے آئیں''۔

ایک ہندوستانی، ایک فرانسیسی اور ایک ایرانی سٹیج پر چلے گئے۔ مسٹر ڈالر نے تینوں کی جیبوں میں جادو کا سکہ ڈال دیا اور تین دفعہ یہ منتر دہرایا۔

چل کوری واشنگٹن والی، کر دے سب کو اندھا
بچ کے جانے پائے نہ کوئی، کس سے سب کا نمدا

حاضرین کو سٹیج پر تین بڑے بڑے الو نظر آئے۔ مسٹر ڈالر نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''حضرات ان الوؤں میں یہ فرق ہے کہ ایک عام الو تو صرف رات کے وقت دیکھ سکتا ہے۔ لیکن یہ وہ الو ہیں جنہیں رات کو بھی نظر نہیں آئے گا''۔ حاضرین یہ شعبدہ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے۔

''حضرات! حضرات! حضرات!!'' مسٹر ڈالر نے تین بار میز پر مکا مار کر کہا۔ اب دیکھئے میرا دوسرا شعبدہ۔ اس کا نام ہے۔ ''بھوکی کٹھ پتلیاں''۔ قسم ہے بیدی لا مار کی خوبصورت آنکھوں کی۔ بڑا دلچسپ شعبدہ ہے یہ! مسٹر ڈالر نے اپنی بش شرٹ کے متعدد بٹن دبائے۔ سٹیج پر پندرہ بیس کٹھ پتلیاں نمودار ہوئیں۔ سب کی شکل وصورت یتیمانہ تھی۔ سب کے ہاتھوں میں ایک ایک چھوٹا سا کشکول تھا اور سب ہاتھ پھیلا پھیلا کر بھیک مانگ رہی تھیں۔ ''حضرات!'' مسٹر ڈالر نے کہا۔ ''یہ بھوکی کٹھ پتلیاں ہیں۔ یہ اتنی کاہل واقع ہوئی ہیں کہ کوئی کام کرنا نہیں چاہتیں۔ ازل سے روٹی کی محتاج ہیں اور شاید ابد تک رہیں گی۔ اس وقت یہ خاموش ہیں۔ لیکن جونہی میں ان کے کشکولوں میں بسکٹ کے ٹکڑے ڈالوں گا، یہ بولنے لگیں گی اور لطف یہ کہ صرف وہی الفاظ بولیں گی جو مجھے پسند ہیں۔ ذرا غور سے ملاحظہ فرمایئے۔ اب میں ان کے کشکولوں میں بسکٹ کے ٹکڑے ڈالتا ہوں ٹکڑے ڈالنے کے بعد مسٹر ڈالر نے پتلیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''دنیا کا سب سے بڑا آدمی کون ہے۔'' پتلیوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ ''مسٹر ڈالر''۔

''میرے خیال میں سورج مغرب سے نکلتا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے''۔

''آپ درست فرماتے ہیں۔ سورج مغرب ہی سے نکلتا ہے''۔

''میری رائے میں اہرامِ مصر، مصر میں نہیں یونان میں ہیں۔ تم کیا کہتے ہو''۔

''جی ہاں۔ وہ یونان ہی میں ہیں''۔

''میں سمجھتا ہوں۔ کالی داس صحرائے کالاہاری میں پیدا ہوا تھا۔ تمہاری کیا رائے ہے''۔

''بلاشبہ وہ کالا ہاری ہی میں پیدا ہوا تھا''۔

''افلاطون فلسفی نہیں تھا''۔

''ہاں جناب بالکل..... اسے فلسفی کون سر پھرا کہتا ہے''۔

''ہاہاہا۔ ہاہا، مسٹر ڈالر نے ایک بلند قہقہہ فضا میں چھوڑتے ہوئے کہا'' دیکھا آپ نے کٹھ پتلیوں کا شعبدہ۔ اسے کہتے ہیں ہتھیلی پر سرسوں جمانا'' مسٹر ڈالر نے اپنی بش شرٹ کے بٹن پھر دبائے۔ سب کٹ پتلیاں غائب ہوگئیں۔

''حضرات۔ حضرات۔ حضرات'' مسٹر ڈالر نے پکار کر کہا۔'' اب تیسرا شعبدہ دیکھنے کے لیے تیار ہو جایئے''۔ اس نے اپنی بش شرٹ کا سب سے قیمتی بٹن دبایا، سٹیج پر فوراً کہیں سے ایک بہت بڑا پٹارا آ گرا۔

حضرات! یہ وہ جادو کا پٹارا ہے جس میں بٹھا کر میں کسی شخص کو بھی غائب کر سکتا ہوں۔

ایک فرد۔ دو فرد۔ پوری قوم۔ سارا ملک! شک کرنے کی ضرورت نہیں، جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ ابھی ابھی آپ کے سامنے یہ شعبدہ دکھایا جائے گا'' مسٹر ڈالر نے حاضرین کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے ایک ایرانی نژاد کو اشارہ کیا کہ وہ سٹیج پر آ جائے۔ جب وہ شخص سٹیج پر ڈرتے ڈرتے آیا، تو مسٹر ڈالر نے اس کا تعارف حاضرین سے کراتے ہوئے کہا۔'' حضرات! یہ ایران کا سب سے معزز شہری ہے۔ اس کی گھر گھر پرستش ہوتی ہے۔ خاص کر عوام تو اس پر اپنی جان چھڑکتے ہیں، لیکن میں اس شخص کو پٹارے میں بٹھا کر غائب کر دوں گا۔ اور کچھ اس طرح سے کہ آپ میں سے کسی کو کیا، خود اسے بھی پتا نہیں چلے گا۔ کہ وہ کہاں چلا گیا۔'' مسٹر ڈالر نے اس شخص کو بیٹھ جانے کے کو کہا۔ اس کے اوپر جادو کا پٹارا رکھا اور بلند آواز سے منتر پڑھا۔

چل گوری واشنگٹن والی، کر دے سب کو اندھا
بچ کے جانے پائے نہ کوئی کس دے سب کا نمدا

جادو کا پٹارا اٹھایا۔ وہ شخص غائب ہو چکا تھا۔ ہاہاہا۔ مسٹر ڈالر نے کہا۔'' حضرات! محض ایک شخص کو غائب کرنا میرے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ قسم ہے مجھے بیٹی ڈیوس کی سڈول پنڈلیوں کی۔ میں نے بڑی بڑی قومیں عظیم سلطنتیں اسی جادو کے پٹارے کی مدد سے آنِ واحد میں غائب کر دیں اور کسی کو آج تک معلوم نہ ہوا کہ وہ کدھر گئیں۔ لیکن حضرات میں ایک بات

عرض کرنا بھول گیا وہ یہ کہ پٹارا آخر پٹارا ہے۔ دوسری صدی قبل از مسیح کی ایجاد۔ ایٹم بم کے دور میں یہ بیکار سی چیز ہے۔ حال ہی میں نے ایک نیا طریقہ ایجاد کیا ہے جس کی مدد سے چشم زدن میں کوئی بھی چیز غائب ہو سکتی ہے۔''

''حضرات! اگر آپ میں ایسے اشخاص موجود ہوں جو زندگی سے بیزار ہیں یعنی جو دن رات خودکشی کرنے کی نئی نئی ترکیبیں سوچتے رہتے ہیں تو وہ آگے آجائیں، یہ شعبدہ دکھانے کے لیے مجھے ایسے اشخاص ہی کی ضرورت ہے۔'' پچاس ساٹھ نوجوان سٹیج پر چلے آئے۔ مسٹر ڈالر نے حسب معمول بش شرٹ کا بٹن دبایا۔ سٹیج پر کوئی گیند نما چیز اچھل کر گری، اسے اس نے اٹھا کر ان نوجوانوں کے درمیان رکھ دیا اور ایک بار پھر بش شرٹ کا بٹن دبایا، ایک خوفناک دھماکا ہوا اور سب نوجوان ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں تحلیل ہو گئے۔

''بابا! ملاحظہ فرمایا آپ نے میرا نیا طریقہ!''

حاضرین اس شعبدے کو دیکھ کر اتنے خوف زدہ ہوئے کہ وہ تالی بجانا بھی بھول گئے۔

''حضرات! حضرات۔!! حضرات!!!'' مسٹر ڈالر نے چلا کر کہا۔ اب میں آپ کو اپنا سب سے بڑا شعبدہ دکھانے لگا ہوں۔ ذرا محتاط ہو جائیے۔ مختصر أعرض کر دوں کہ اس شعبدے کا تعلق میری اپنی ذات سے ہے۔ میک یعنی بلیک آرٹ کی مدد سے میں اپنے آپ کو اندھا کر لوں گا۔ مجھے کوئی چیز دکھائی نہیں دے گی چاہے وہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہو۔''

حاضرین حیران ہو کر مسٹر ڈالر کے منہ کی طرف دیکھنے لگے۔ مسٹر ڈالر نے بٹن دبا کر ایک عجیب قسم کی عینک برآمد کی اور اسے آنکھوں پر لگا لیا۔ پھر حاضرین کو یہ مژدہ سنایا ''حضرات! اب میں مکمل طور پر اندھا ہو گیا ہوں۔ آپ مجھے کوئی چیز بھی دکھائیں مجھے وہ نظر نہیں آئے گی۔''

ایک ہندوستانی سٹیج پر آیا۔ اس نے تاج محل کا ایک خوبصورت ماڈل دکھاتے ہوئے مسٹر ڈالر سے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

مسٹر ڈالر نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''کچھ بھی نہیں''۔

ہندوستانی نے اسے ایک کتھک ناچ کی پینٹنگ دکھائی۔ ''اور یہ؟''

''یہ بھی کچھ نہیں''۔

ایک چینی نے اسے سٹیج پر آ کر اپنے ملک کا نقشہ دکھایا۔ مسٹر ڈالر نے حسب معمول سر

ہلاتے ہوئے کہا، ''مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا۔ کچھ بھی نظر نہیں آتا؟''

چینی نے ہنس کر کہا۔ ''عجیب مسخرے ہو۔ ابھی چند منٹ پہلے تو چنگے بھلے تھے۔ تمہیں ہو کیا گیا؟ دیکھتے نہیں یہ چین ہے۔ پچاس کروڑ چینیوں کا وطن''۔

''نہیں یہ کچھ بھی نہیں''۔

مسٹر ڈالر کا اور زیادہ امتحان لینا بے سود تھا۔ اس لیے حاضرین نے اتفاق رائے سے فیصلہ کیا کہ وہ واقعی اندھا ہو گیا۔ اس فیصلے پر حاضرین کی بجائے مسٹر ڈالر نے تالیاں پیٹیں۔

مسٹر ڈالر نے آنکھوں پر سے عینک اتاری۔ اب اسے پھر ہر چیز نظر آنے لگی۔ اس نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''حاضرین شعبدے تو میں اور بھی دکھا سکتا ہوں۔ لیکن آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ اس آخری شعبدے کے بعد وہ کچھ پھیکے سے لگیں گے۔ اس لیے معذرت چاہتا ہوں اور اجازت بھی۔ شب بخیر!''۔

مسٹر ڈالر نے آخری بار بش شرٹ کا بٹن دبایا اور سٹیج سے غائب ہو گیا۔

☆☆☆

کہ پہچانی ہوئی صورت بھی.....

ایک زمانہ تھا کہ احباب ہمارے متعلق کہا کرتے تھے۔ ''غضب کا حافظہ پایا ہے آپ نے، برسوں کی بات آپ کو اس طرح یاد رہتی ہے، جیسے وہ کل کی یا زیادہ سے زیادہ پرسوں کی بات ہو!'' غیر تو غیر خود ہمیں اپنے حافظے پر رشک آیا کرتا تھا۔ اور اب کہ عمر پچپن سے تجاوز کر چکی ہے۔ یہ حال ہے کہ بسا اوقات دوپہر کے وقت سوچنا پڑتا ہے کہ صبح کا ناشتا کر لیا ہے یا ابھی کرنا ہے۔ سگریٹ جو سلگانے کے لیے نکالا تھا، منہ میں رکھ لیا ہے، یا پھر سگریٹ کیس ہی میں رکھ دیا ہے۔ جس درزی سے قمیض کا مطالبہ کر رہے ہیں، وہی ہے جسے کپڑا لا کر دیا تھا یا اس سے ملتا جلتا کوئی دوسرا ہے۔ خیر یہ معمولی پریشانیاں ہیں، انہیں اٹھایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کا اب کیا کیا جائے کہ آئے دن کوئی شناسا صورت سوالیہ نشان بن کر سامنے کھڑی ہو جاتی ہے اور پوچھتی ہے۔ ''مجھے پہچانا؟'' اس وقت یہ حال ہوتا ہے کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ کلکتے میں؟ شاید دہلی میں؟ لیکن ان شہروں میں تو سیکڑوں آدمیوں سے ملے تھے۔ تو پھر یہ کون ہو سکتے ہیں۔ اچھا تو یہ

وہ ہیں جن سے ایک بار راہ چلتے کلکتہ یونیورسٹی کا راستہ دریافت کیا تھا۔ لیکن یہ بنگالی تو معلوم نہیں ہوتے، تو پھر وہی ہوں گے جنہیں ایک بار کسی مشاعرے میں سنا تھا یا شاید؟ اف کچھ سمجھ میں نہیں آتا، اس لیے جھوٹ موٹ کہہ دیتے ہیں۔ ''ہاں صاحب! کیوں نہیں پہچانا، بھلا آپ کو کیسے بھول سکتے ہیں؟'' اکھڑا اکھڑا لہجہ صاف بتا رہا ہے کہ ہم حکمتِ عملی سے کام کر رہے ہیں۔ آخر نو وارد بھی اتنا کم سمجھ نہیں کہ ہماری گھبراہٹ کو بھانپ نہ جائے۔ اس لیے وہ فوراً پوچھتا ہے۔ ''بھلا بتائیے تو ہم کون ہیں؟'' اب اس سوال کا کیا جواب دیا جائے یعنی۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتائے کہ ہم بتلائیں کیا

اگر یہ جانتے کہ آپ کون ہیں تو مصافحہ کرتے وقت ہی نہ بتلا دیتے، ایک بار پھر ان کے چہرے کی طرف غور سے دیکھنے کے بعد ہم کہتے ہیں ''اگر ہم غلطی نہیں کر رہے تو آپ ہمارے استاد مولوی رمضان علی ہیں۔ ہم آپ سے آٹھویں جماعت میں فارسی پڑھا کرتے تھے۔''

''ہا ہا ہا۔ مولوی رمضان علی۔ خوب پہچانا آپ نے۔ اجی حضرت میں تو آپ کا شاگرد قربان علی ہوں۔ میں آپ سے دسویں جماعت میں انگریزی پڑھا کرتا تھا''۔

''آہا ہا۔ قربان علی۔ ہاں بھئی تو واقعی قربان علی ہو۔ لیکن اس وقت تمہاری ڈاڑھی نہیں ہوا کرتی تھی۔ ٹھیک ہے نا؟''۔

جناب اس وقت عمر ہی کیا تھا جو ڈاڑھی ہوتی۔ اس وقت تو میں بچہ تھا۔''

''بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن اب تو آپ خاصے بزرگ نظر آتے ہیں۔ شاید ڈاڑھی کی بدولت۔''

اس ڈاڑھی کا بھی عجیب قصہ ہے صاحب! ایک بار میرا سیفٹی ریزر گم ہو گیا۔ دوسرا خریدنے کا مقدور نہ تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ شیو نہیں کیا کروں گا۔ بس اس دن سے جو ڈاڑھی نے بڑھنا شروع کیا، اب تک برابر بڑھتی چلی جا رہی ہے''۔

تبھی تو میں بھی دل میں سوچ رہا تھا کہ ہے تو قربان علی۔ لیکن اس کمبخت نے یہ حلیہ کیا بنا رکھا ہے۔

''لیکن صاحب یہ رہی خوب۔ آپ کو اپنے شاگرد پر اپنے استاد کا دھوکا ہوا''۔

''نہیں نہیں دھوکا نہیں ہوا۔ دراصل اس وقت جو تمہاری وضع قطع ہے وہ بالکل مولوی

رمضان علی سے ملتی ہے۔ خدا بخشے بڑی خوبیوں کے مالک تھے مولوی صاحب۔ اس محنت اور محبت سے فارسی پڑھایا کرتے تھے کہ داد نہیں دی جاسکتی۔ اب ایسے استاد کہاں''۔

''پھر بھی آپ کا دم غنیمت ہے صاحب۔''

''اجی نہیں۔ میں کیا ہوں۔ میں تو اگر آپ کی طرح ڈاڑھی بھی رکھ لوں تو مولوی رمضان علی کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا..... اچھا کوئی میرے لائق خدمت؟''

''بس نیاز حاصل کرنے ہی آیا تھا۔ اب اجازت دیجئے۔''

وہ چلے جاتے ہیں۔ اور ان کی غیر حاضری میں اپنے حافظے کا ماتم کرنے کا جی چاہتا ہے۔ قربان علی کو مولوی رمضان علی سے خلط ملط کر بیٹھے، اف کتنی غلطی ہوئی۔

چند دنوں کے بعد گاڑی کے انتظار میں پلیٹ فارم پر ٹہل رہے ہیں کہ کسی نے نہایت بے تکلفانہ انداز میں ہمارا نام پکارتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کہا چوبڑہ صاحب اک نظر ادھر بھی۔''

حیرانی کے عالم میں ہم ایک اجنبی سے پوچھتے ہیں۔ ''کیوں صاحب آپ نے ہمیں آواز دی۔'' وہ مسکرا کر جواب دیتا ہے۔ ''جی ہاں اگر آپ کا نام گنیش داس چوبڑہ ہے تو''۔

فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ یہ شخص ہمیں جانتا ہے لیکن ہم اسے نہیں پہچانتے۔ وہ ہماری گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پھر کہتا ہے۔ ''اگر آپ مراد آباد کے رہنے والے ہیں تو.....''۔

یہ تو ٹھیک کہتا ہے، رہنے والے تو ہم مراد آباد ہی کے ہیں۔

''اگر آپ کے چھوٹے بھائی کا نام موتی ساگر ہے تو.....''

یہ بھی درست ہے۔

اگر آپ لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھتے رہے ہیں تو.....''

یا الٰہی! یہ شخص تو غیب کا علم جانتا ہے ابھی ابھی کہے گا۔ اگر آپ کی بیوی کا نام رنجنا دیوی ہے تو۔ اگر آپ کے سات بچے ہیں تو۔ اگر آپ کی نرستاون سال ہے تو لیکن یہ ہے کون؟ ہماری تو اس سے پہلی ملاقات معلوم ہوتی ہے۔ وہ ایک بار پھر مسکرا کر پوچھتا ہے۔ ''کہئے پہچانا ہمیں؟''

''جی ہاں۔ پہچان لیا؟''

''تو پھر بتائیے ہم کون ہیں؟''

''آپ ہمارے خیال میں بنارس کے مشہور جیوتشی رنگ بہاری لال ہیں کہ جو جنم پتری

دیکھے بغیر ماضی، حال، مستقبل کی تمام باتیں بتا دیتے ہیں''۔

''واہ! چوپڑہ صاحب واہ۔ اتنی جلدی بھول گئے۔ اجی ہم رنگ بہاری نہیں شام مراری ہیں۔ 1940ء میں آپ سری نگر میں اپنے بھائی موتی ساگر کے ساتھ ہمارے ہوٹل میں ہی ٹھہرے تھے''۔

اتنے میں گاڑی آ جاتی ہے۔ ہم شام مراری سے اجازت لے کر ایک ڈبے میں داخل ہو جاتے ہیں اور اپنی سیٹ پر بیٹھ کر سوچتے ہیں۔ یہ شام مراری بھی عجیب قسم کے ہوٹل پروپرائیٹر واقع ہوئے ہیں۔ 1940ء میں ہم ضرور ملے تھے۔ لیکن یہ سولہ سال کی بات ہے۔ اس پر فرماتے ہیں اتنی جلدی بھول گئے اونہہ! جیسے سولہ برس کا عرصہ معمولی عرصہ ہوتا ہے۔ شام مراری کی سادہ لوحی پر دل ہی دل میں تبصرہ کرنے کے بعد جونہی ہم سامنے والی سیٹوں پر نظر دوڑاتے ہیں۔ ایک شخص ہماری طرف گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔ عمر میں ہم سے پانچ سال چھوٹا، چاند انڈے کی طرف صاف شفاف آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں والی عینک۔ دو ایک منٹ کے بعد وہ ہماری طرف لپک کر کہتا ہے۔ ''میرے خیال میں آپ پروفیسر چوپڑہ ہیں''۔

ہم بڑی بے رخی سے جواب دیتے ہیں۔ ''جی ہاں آپ کا خیال درست ہے''۔

''آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں''۔

ہم نفی میں سر ہلاتے ہیں۔

''ذرا کوشش کیجئے آپ مجھے جانتے ہیں''۔

''کچھ اتا پتا بتایئے تو کوشش کریں''۔

''کلکتے میں ملاقات ہوئی تھی''۔

''کب؟''۔

''سات برس کی بات ہے''۔

''اچھا۔ ہاں ہاں۔ سمجھ گئے۔ تو آپ ہیں، کہئے آپ کی وہ فلم مکمل ہو گئی؟''۔

''کون سی فلم؟''۔

''وہی کیا نام تھا، اس کا، لیمپ کا جادو!''۔

''لیمپ کا جادو؟''۔

''نہیں نہیں۔ جادو کا لیمپ''۔

''جادو کا لیمپ؟ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟''۔

''تو کچھ اور نام ہوگا۔ بہر حال وہ مکمل ہوگئی نا؟

''لیکن صاحب میں فلم لائن میں نہیں ہوں''۔

''فلم لائن میں نہیں ہوں؟ تو کیا آپ ڈائرکٹر گھوش نہیں ہیں؟''۔

''اجی کہاں ڈائرکٹر گھوش۔ کہاں ایک معمولی پوسٹ مین''۔

''معمولی پوسٹ مین؟''۔

''جی ہاں۔ میں اجے کمار پوسٹ میں ہوں۔ ٹالی گنج میں جہاں آپ ٹھہرے تھے۔ میں آپ کی ڈاک لایا کرتا تھا۔ پوجا کی چھٹیوں میں آپ نے مجھے انعام بھی دیا تھا۔''

''ہاں ہاں۔ بالکل بالکل۔ آپ اجے کمار ہیں۔ معاف کیجئے۔ مجھے مغالطہ اس لیے ہوا کہ ڈائرکٹر گھوش بھی آپ کی طرح.....''

''ہاں ہاں گنجے ہیں''۔

''لیکن۔ یہ آپ یک لخت گنجے کیسے ہوگئے۔ اس وقت تو آپ کے سر پر کافی بال تھے''۔

''یہ سب نزلے کی مہربانی ہے، صاحب پچھلی گرمیوں میں سارے بال جھڑ گئے''۔

''اوہو۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ ان گرمیوں میں خیال رکھیے گا''۔

''جی''۔

''کچھ نہیں۔ ویسے اور تو خیرت ہے نا''۔

''جی ہاں! جی ہاں!''۔

اتنے میں گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی، اجے کمار، جے ہند کہہ کر رخصت ہوئے اور ہم گنجے پن کی کرامات پر غور کرنے لگے جس کی بدولت سب گنجے ایک سے نظر آتے ہیں۔ بارہا یوں بھی ہوتا ہے کہ سڑک پر چلتے ہوئے ہم نے کسی شخص کو دیکھا اور اس کے قریب جا کر کہا۔

''آداب عرض کہئے آپ کب تشریف لائے؟'' اس نے ہمیں بالکل نہ پہچانتے ہوئے جواب دیا۔ ''معاف کیجئے آپ کو مغالطہ ہوا''۔ ہم نے فوراً کہا۔ ''اجی ہمیں بنا رہے ہیں۔ آپ ٹھیک ہے۔ بہت بڑے افسر جو ٹھہرے''۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا''۔

''ہاں جناب اب آپ ہمارا مطلب کیوں سمجھنے لگے۔ گورنمنٹ کالج کے پرنسپل جو ہوئے''۔

''گورنمنٹ کالج کا پرنسپل۔ یہ آپ سے کس نے کہا؟''۔

''اجی کہنا کس نے تھا۔ اخبار میں جو چھپا کہ یکم فروری سے آپ پرنسپل بنا دیے گئے ہیں''۔

''جی وہ کوئی اور صاحب ہوں گے''۔

''جی نہیں ہم نے خود پڑھا تھا کہ ریاض احمد پرنسپل مقرر کیے گئے ہیں''۔

''معاف کیجئے۔ میں ریاض احمد نہیں ہوں''۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''۔

''کیونکہ میرا نام احمد علی ہے اور میں میونسپلٹی میں کلرک ہوں''۔

''اوہ! بڑی غلطی ہوئی۔ معذرت چاہتا ہوں''۔

''کوئی بات نہیں۔ ایسا اکثر ہو ہی جاتا ہے''۔

وہ چلا جاتا ہے۔ اور ہم اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے ہیں۔ اور سوچتے ہیں وہ وقت قریب آ رہا ہے جب ہر شخص پر ہمیں کسی دوسرے شخص کا دھوکا ہوا کرے گا اور جب لوگ ہمارے توازن کے متعلق عجیب وغریب رائیں قائم کریں گے۔ کتنی مضحکہ خیز صورت حال ہوگی۔ جب مثال کے طور پر ہم کسی ناواقف عورت سے کہیں گے۔ ''نمستے بھابی ..... کہئے مزاج کیسا ہے''۔ اور وہ خشم آلود نگاہوں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے جواب دے گی۔ ''شرم نہیں آتی آپ کو راہ چلتی عورتوں سے مذاق کرتے''۔ اور۔

جو کسی شوخ وشنگ حسینہ سے پالا پڑ گیا تو..... بچاؤ کی صرف یہی صورت ہے کہ آئندہ کسی کو پہچاننے کی کوشش ہی نہ کریں۔ ہر ملاقاتی سے مصافحہ کرنے کے بعد کہہ دیا کریں۔ ''ہم سے یہ امید مت کیجئے گا کہ ہم آپ کو پہنچان لیں گے، دراصل کثرتِ مطالعہ کی وجہ سے بینائی اس قدر کمزور ہوگئی ہے کہ غیر تو غیر ہم اپنے کو بھی نہیں پہچان سکتے۔

ہو گئے مضمحل قویٰ غالب!
اب عناصر میں اعتدال کہاں

☆☆☆

ادبی مشیر

قریب قریب ہر ایک خاندان میں ایک بزرگ ایسا بھی ہوتا ہے جس نے عالمِ شباب میں کسی گمنام اخبار یا رسالے میں دو ایک مضامین لکھے ہوں۔ شاید ان میں بتایا گیا تھا کہ بینگن کا بھرتہ کس طرح بنانا چاہیے، یا کالی کھانسی کے لیے شربت بنفشہ اچھا رہتا ہے یا شربتِ بادام۔ اس کے بعد وہ کچھ اس لیے نہ لکھ سکے کہ خانگی یا کاروباری دھندوں نے انہیں لکھنے کے لیے فرصت ہی کب دی۔ پھر بھی انہوں نے متعدد بار کچھ لکھنے کی ناکامیاب کوشش ضرور کی۔ مثلاً انہوں نے ایک ناول ''فاختہ کا گھونسلا'' لکھنا شروع کیا لیکن دس صفحے لکھنے کے بعد بند کر دیا۔ ایک کتاب تنقید پر لکھنا چاہتے تھے۔ نام تھا ''بال کی کھال'' لیکن براہو کسی اور نقاد کا کہ اس نے ان سے پہلے یہ کتاب لکھ ڈالی۔ اب ان کا خیال ہے کہ یہی کتاب ''بات کا بتنگڑ'' نام سے لکھی جائے۔ لیکن کب؟ یہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ یہ سب تو فرصت اور فراغت پر منحصر ہے اگر کافی فرصت ملی تو ضرور لکھیں گے۔

یہ بزرگ خاندان کے ان افراد کو جنہیں ادب سے مس ہے، مشورہ دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ دراصل ان کی حیثیت دوست، راہ نما اور فلسفی کی ہے۔ جونہی انہیں پتا چلتا ہے کہ ان کے خاندان کے کسی فرد نے کچھ لکھنے کا ارادہ کیا ہے، یہ اسے اپنے ہاں بلاتے ہیں یا خود اس کے یہاں پہنچ جاتے ہیں اور اگر کہیں باہر گئے ہوئے ہیں تو ایک مفصل خط میں لکھنے سے متعلق تمام ضروری باتیں لکھ بھیجتے ہیں۔ ابھی پرسوں ہی دیوی کے نام انہوں نے ایک خط لکھا:۔

''ڈیر نلنی دیوی!

جیتی رہو۔ نکلیش نے مجھے بتایا کہ تم گھر والوں سے چوری چھپے گیت لکھا کرتی ہو اور کبھی کبھی مشاعروں میں شرکت بھی کرتی ہو۔ لیکن تمہارے والدین کو تمہارا گیت لکھنا بالکل پسند نہیں۔ خیر، انہیں میں سمجھا دوں گا۔ اول تو سمجھ جائیں گے، نہ بھی سمجھیں تو تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ایک ادیب کو بڑی بڑی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میری مثال ہی لے لو۔ میں نے اپنا پہلا مضمون بارہ برس کی عمر میں لکھا۔ عنوان تھا ''شلجم کا اچار'' جب یہ مضمون میری والدہ نے پڑھا تو بہت ناراض ہوئیں، کہنے لگیں

اچار بنانے کا جو طریقہ تم نے لکھا ہے وہ بالکل غلط ہے! اگر کسی عورت نے اس طریقہ پر عمل کرتے ہوئے اچار بنایا تو نہ صرف شلجم خراب ہو جائیں گے بلکہ وہ مرتبان بھی، جس میں اچار بنایا جائے گا''۔

میں نے ان سے کہا۔

یہ طریقہ میرا اپنا طریقہ ہے۔ اس لیے میں اس کے خلاف ایک لفظ ''سننا نہیں چاہتا''۔

ان کی نکتہ چینی کی پروانہ کرتے ہوئے میں نے اسی دن ایک اور مضمون لکھ ڈالا۔ عنوان تھا۔ ''آنولے کا مربا'' اس مضمون کو پڑھ کر میرے والد بہت سیخ پا ہوئے۔ کہنے لگے ''تو کچھ پڑھے گا بھی کہ اچار مربے ہی بناتا رہے گا''۔ میں نے ان کے غصے کی بھی پروانہ کی اور برابر لکھتا گیا۔ آخر ایک دن سب کو ماننا پڑا کہ میں پیدائشی ادیب ہوں۔ تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں والدین کی مخالفت کی پروانہیں کرنی چاہیے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ تم گیت اچھے لکھو اور اچھے گیت لکھنے کا راز یہ ہے کہ تب تک گیت نہ لکھا جائے، جب تک خوب پیٹ بھر کر کھانا کھا لیا جائے۔ کچھ شاعر چائے کا ایک پیالہ پینے کے بعد گیت لکھنے لگتے ہیں۔ اس پیالے میں دودھ کے دو تین قطرے ہوتے ہیں اور چینی بالکل نہیں ہوتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جیسی کڑوی چائے پیتے ہیں، ویسے ہی کڑوے گیت لکھتے ہیں۔ تمہارے پاس پرماتما کا دیا سب کچھ ہے۔ تن ایسی غلطی کبھی نہ کرنا۔

گیت لکھنے کے متعلق دوسری بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے، یہ ہے کہ گیت ہمیشہ کسی اچھے موضوع پر لکھا جائے کوئی، بلبل یا بیٹر پر گیت لکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ان پر تو ہزاروں شاعروں نے پہلے ہی گیت لکھ دیئے ہیں۔ اس لیے تمہیں کسی ایسے پرندے پر گیت لکھنا چاہیے، جس پر آج تک کوئی گیت نہ لکھا گیا۔ مثلاً شتر مرغ۔ اب شاید تم پوچھو گی:

''کیا شتر مرغ بھی گیت گاتا ہے؟''

ہاں ہاں۔ کیوں نہیں گاتا۔ کون سا پرندہ، جانور یا انسان ترنگ میں آ کر گیت نہیں گاتا۔

تیسری بات جو تمہیں کبھی نہیں بھولنا چاہیے، یہ ہے کہ گیت میں جذبات کی بجائے لے کا ہونا زیادہ ضروری ہے۔ اس لیے تمہیں ایسے گیت لکھنا چاہیے جن میں جذبات کم ہوں۔ لیکن جن کی لے پر سر دھننے کو جی چاہے۔ میرے خیال میں وہ گیت فوراً مقبول ہو سکتا ہے جس میں جذبات بالکل نہ ہوں، بس لے ہی لے ہو۔ ایسے گیت لکھنے کے لیے تمہیں کافی مشق کرنا پڑے گی۔

جذبات کو آہستہ آہستہ گھٹانا یہاں تک کہ وہ بالکل نہ ہونے کے برابر رہ جائیں، بڑا مشکل کام ہے۔ لیکن اگر شاعر ہمت نہ ہارے تو اتنا مشکل بھی نہیں۔ آخری بات جو تمہیں یاد رکھنی چاہیے، یہ ہے کہ گیت زیادہ لمبے نہیں ہونے چاہئیں۔ زیادہ سے زیادہ ان میں سات یا آٹھ سطور ہونی چاہئیں۔ چھوٹے گیتوں میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ انہیں ہر شخص پڑھ لیتا ہے۔ لمبے گیت ایک تو کافی وقت لیتے ہیں، دوسرے انہیں لکھتے وقت شاعر اتنا الجھ جاتا ہے کہ گلاب کے پھول پر گیت لکھتے لکھتے گل قند پر لکھ ڈالتا ہے۔

ایک بات اور آئندہ جو بھی گیت لکھو، اس کی ایک کاپی مجھے ضرور بھجواؤ، تاکہ اس کو پڑھنے کے بعد میں تمہیں اپنی رائے سے مطلع کر سکوں۔

میں ہوں تمہارا خیر اندیش

ایک بزرگ

یہ بزرگ نہ صرف گیت لکھنے کا ڈھنگ بتا سکتے ہیں، بلکہ ناول کس طرح لکھنا چاہیے، اس کے متعلق بھی بہت کچھ کہہ سکتے ہیں۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو یہ خط پڑھئے جو تھوڑے دن ہوئے انہوں نے اپنے بھانجے اہناش چندر کو لکھا۔

ڈیر اہناش چندر!

تمہارا نیا ناول ''دوج کا چاند'' ریلوے بک اسٹال سے خرید کر پڑھا۔ تم سے تو یہ بھی نہ ہو سکا کہ ناول کی ایک کاپی ہی بھجوا دیتے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ معاف کرنا تمہارا نیا ناول مجھے بالکل پسند نہیں آیا۔ بھلا ''دوج کا چاند'' بھی کوئی نام ہے۔ جو بات ''چودھویں کے چاند میں'' ہے، وہ بھلا ''دوج کے چاند'' میں کہاں؟ ہیروئن کا نام تم نے ''مالتی'' رکھا ہے۔ ''دوج کا چاند'' کی ہیروئن کا نام چندر مکھی یا چاند رانی ہوتا تو مزہ آ جاتا۔ ہیرو کے لیے چندر بھان کا نام بڑی آسانی سے چنا جا سکتا تھا۔ تمہارے ناول میں ہیرو اور ہیروئن میں پہلی ملاقات ساتویں باب میں ہوتی ہے حالانکہ میرے خیال میں پہلے باب میں ہو جانی چاہیے تھی۔ بارہویں باب میں ہیرو، ہیروئن سے ناراض ہو کر بکانیر چلا جاتا ہے۔ بیکانیر کے بجائے اگر تم اسے شملہ یا منصوری بھیج دیتے تو کتنا اچھا رہتا۔ وہاں اس کی ملاقات کسی اور لڑکی سے کرائی جا سکتی تھی۔ ملاقات نہ بھی ہوتی تو کم از کم اس کی صحت تو اچھی ہو جاتی۔ تم شاید نہیں جانتے کہ ایک تندرست

ہیرو ناول کے لیے کتنا ضروری ہوتا ہے۔ تمہارے ناول پر مفصل تنقید پھر کبھی کروں گا۔ اس خط میں تمہیں ایک پلاٹ بتانا چاہتا ہوں۔ اس کا استعمال تم اپنی اگلے ناول میں کر سکتے ہو۔ در اصل یہ ایک سچا واقعہ ہے اور اتنا دلچسپ کہ اگر میرے پاس وقت ہوتا تو میں خود اسے ناول کا موضوع بناتا۔ ہاں تو وہ واقعہ یہ ہے:۔

ایک بار میں کلکتے گیا۔ جس ہوٹل میں ٹھہرا، وہاں میری ملاقات ایک نوجوان عورت سے ہوئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کا خاوند گھر سے بھاگ گیا ہے اور وہ ہوٹل میں برتن صاف کر کے اپنا گزارہ کر رہی ہے۔ مجھے اس نوجوان عورت پر بہت ترس آیا۔ میں نے اس کے گم شدہ خاوند کو ڈھونڈ لانے کا تہیہ کر لیا۔ بنگال کا۔ چھان مارا لیکن اس بھلے مانس کا پتا نہ چلا کونا کونا واپس کلکتے آیا اور اس عورت سے پوچھا کہ اس کا خاوند اس سے کس بات پر ناراض ہو کر گھر سے چلا گیا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ ان کے گھر میں ایک بلی تھی جسے میں بے حد چاہتی تھی۔ لیکن اس کے خاوند کو اس سے نفرت تھی"۔

"وہ بلی اب کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اب بھی میرے پاس ہے۔" عورت نے جواب دیا۔ "وہ بلی لاؤ"۔ میں نے اس سے کہا۔ بلی لے کر میں اس شخص کی تلاش میں دوبارہ روانہ ہوا۔ ایک دن بلی کو اپنے کندھے پر بٹھا کر دہلی کے چاندنی چوک میں سے گزر رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں۔ ایک آدمی جس نے بھگرے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ بلی کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے۔ فوراً سمجھ گیا کہ یہی وہ شخص ہے جس کی تلاش میں میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر کہا۔ "سچ بتاؤ تم پرتوش کمار گھوش تو نہیں ہو"۔ پہلے تو اس نے مجھے ادھر ادھر کی باتوں میں ٹالنا چاہا لیکن جب میں نے اس کے منہ پر زور سے ایک تھپڑ مارا تو اس نے روتے روتے کہا:

"میں پرتوش کمار گھوش ہی ہوں"۔

میں نے اس سے کہا۔ "فوراً میرے ساتھ کلکتے واپس چلو، نہیں تو ابھی پولیس کے حوالے کرتا ہوں"۔ وہ میرے ساتھ چلنے پر راضی ہو گیا۔ اس نوجوان عورت نے جب اپنے خاوند کو دیکھا تو خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ میں نے اس سے کہا۔ "بلی ہی تمہارے خاوند کو تم سے دور لے گئی اور بلی ہی اسے تمہارے نزدیک لے آئی"۔

تو یہ ہے وہ واقعہ، اسے تم اپنے دوسرے ناول کا موضوع بنا سکتے ہو۔ اس کا نام بڑی آسانی سے ہوسکتا ہے۔ ''ایک عورت ایک بلی''۔ اگر یہ نام پسند نہ آئے۔ تو ''بلی کا کرشمہ'' رکھا جا سکتا ہے۔

تمہارا خیر اندیش

تمہارا ماموں''

لیکن آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ بزرگ مزاحیہ مضامین کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مزاحیہ مضامین کے متعلق بھی ان کی واقفیت کافی ہے۔ زیادہ مدت نہیں ہوئی۔ انہوں نے اپنے ایک عزیز کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ پڑھا تھا۔ اس پر انہوں نے اپنی رائے کا اظہار مندرجہ ذیل خط میں کیا۔

''ڈیر آنند کمار!

سدا آنندر ہو گے۔ تم نے کیا کیا کہ افسانہ لکھتے لکھتے مزاحیہ مضامین لکھنا شروع کر دیے۔ مزاحیہ مضامین لکھنا تمہارے بس کی بات نہیں۔ یہ صرف وہ آدمی لکھ سکتا ہے جسے زندگی کا کافی تجربہ ہو۔ تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن۔ تمہیں مزاحیہ مضامین لکھنے کے لیے کم از کم تیس برس اور انتظار کرنا پڑے گا۔ میں اگر چاہوں تو کامیاب مضمون لکھ سکتا ہوں کیونکہ میری عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہے۔ لیکن کیا کہا جائے، لکھنے کے لیے فرصت ہی نہیں ملتی۔ اب میں تمہارے دو ایک مضامین کی طرف آتا ہوں۔ تمہارا ایک مضمون ہے ''ہم بہشت میں پہنچے''۔ پہلے تو عنوان ہی غلط ہے۔ جب تک تمہاری وفات نہ ہو جائے تم بہشت یا دوزخ میں جا کس طرح جا سکتے ہو؟ اور چلے بھی جاؤ تو پھر وہاں سے واپس کس طرح آ سکتے ہو؟ وہ بہشت ہی کیا جس سے لوٹ کر دنیا میں پھر آنے کو جی چاہے۔ بہشت میں، تم نے جن باتوں کو دیکھا اور جن کا ذکر اپنے مضمون میں کیا وہ بھی عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ تم لکھتے ہو۔ بہشت میں کوئی ہسپتال نہیں۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہاں جو لوگ بیمار ہوتے ہیں وہ علاج کہاں کراتے ہیں؟ اگر تم یہ کہتے ہو کہ بہشت میں کوئی بیمار نہیں ہوتا تو میں یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں۔ کیونکہ جب کھانے پینے کو طرح طرح کی لذیذ چیزیں ملیں تو زیادہ کھا جانا قدرتی ہے اور زیادہ کھا کر آدمی ضرور بیمار ہو گا۔ خاص کر

جب وہ کسی قسم کی ورزش بھی نہ کرتا ہو۔ آگے چل کر تم نے لکھا ہے کہ بہشت میں زیادہ گرمی ہوتی ہے نہ سردی۔ یعنی موسم معتدل رہتا ہے تو یہ بات بھی عجیب ہے کیونکہ اگر موسم ہمیشہ معتدل رہتا ہے تو گرمی کے موسم میں پیدا ہونے والے پھل اور ترکاریاں بہشت میں نہیں ہو سکتیں۔ یعنی وہاں نہ آم ہو سکتا ہے نہ کریلے، بھلا وہ کیسی بہشت ہوئی جہاں کوئی کام کا پھل پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ دراصل تم سے یہ غلطیاں اس لیے سرزد ہوئیں کہ تمہیں بہشت کی زندگی کا کوئی تجربہ نہیں۔

ایک اور مضمون ہے ''ہم سسرال گئے''۔ مجھے یہ مضمون پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ ابھی سگائی تو تمہاری ہوئی نہیں اور سسرال کے خواب دیکھنے لگے۔ سسرال کا جو نقشہ تم نے کھینچا ہے، وہ حقیقت سے بعید ہے۔ تم لکھتے ہو کہ تمہاری ساس کے اتنے بچے تھے کہ جب تم نے ان سے ان کے نام پوچھے تو وہ ایک بچے کا نام ہی بھول گئی۔ یہ بات ناممکن ہے کوئی ماں، چاہے اس کے کتنے ہی بچے ہوں ان کا نام نہیں بھول سکتی۔ اسی طرح قریب قریب، ہر مضمون میں تم نے بے شمار پٹخنیاں کھائی ہیں۔ اور پھر میں پوچھتا ہوں، اس قسم کے مضامین لکھنے کا کیا فائدہ ہے۔ تمہیں ایسے مضامین لکھنے چاہئیں جو دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ مفید بھی ہوں۔ مثلاً ''ہم نے دیسی صابن کیسے تیار کیا؟''۔ ''ہم نے افیم کیسے چھوڑی؟''۔ ''ہم نے آلو کا رائتہ کس طرح بنایا؟'' وغیرہ وغیرہ۔ مطلب یہ کہ مضمون میں کام کی باتیں ہونی چاہئیں، صرف طنز و مزاح ہی کافی نہیں۔ امید ہے آئندہ جب کبھی مزاحیہ مضمون لکھو گے، ان باتوں کا خیال رکھو گے۔

خیر اندیش

تمہارا ایک بزرگ''

ملاحظہ فرمایا آپ نے ان بزرگ کی ادب کے بارے میں کتنی واقفیت ہے۔ سچ پوچھئے تو ان کا دم ہی غنیمت ہے۔ اگر یہ نہ کوئی گیت لکھ سکے نہ ناول اور نہ ہی مزاحیہ مضمون۔ یعنی لکھنے کا سارا کام ہی رک جائے اور بے چارے ادبا، مایوس ہو کر خودکشی کر لیں۔

☆☆☆

دوست راہ نما فلسفی

نام تو ان کا کچھ اور ہے لیکن محلے میں وہ چچا افلاطون کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے سن وسال کو مدنظر رکھتے ہوئے اس سے بہتر لقب ان کے لیے تجویز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ محلے میں ان کی حیثیت، دوست، راہ نما اور فلسفی کی ہے۔ یعنی وہ محلے میں رہنے والے ہر شخص کے دوست ہیں، چاہے وہ شخص انہیں دوست سمجھے یا نہ سمجھے۔ راہ نما ہیں چاہے وہ ان پر ایمان لائے یا نہ لائے اور فلسفی ہیں چاہے ان کی باتوں میں مغز ہو یا نہ ہوا۔ دراصل چچا افلاطون اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ دوسرے لوگ ان کے متعلق کیا رائے قائم کرتے ہیں۔ اگر پروا کرتے تو پھر وہ چچا افلاطون نہ ہوتے، ہماری اور آپ کی طرح ''دفتر'' میں قلم گھسا کرتے یا دوکان پر سودا سلف بیچا کرتے۔

چچا افلاطون کو جس وقت پتا چلتا ہے کہ محلے میں کسی شخص پر مصیبت آنے والی ہے یا آئی ہے، وہ فوراً اس کے پاس پہنچتے ہیں اور اس کو اپنے مشوروں سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ بہم پہنچاتے ہیں۔ پچھلے دنوں میری نظر کمزور ہو گئی، آنکھوں کا معائنہ کرایا۔ ڈاکٹروں نے عینک استعمال کرنے کا مشورہ دیا۔ عینک بنوانے جا رہا تھا کہ راستے میں چچا افلاطون سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے کہا۔

''دماغ چل گیا ہے تمہارا۔ اس عمر میں عینک لگا رہے ہو، بڑھاپے میں کیا کرو گے''

''بڑھاپے میں؟ ظاہر ہے کہ بڑھاپے میں بھی عینک استعمال کروں گا''۔

''میاں ہوش کی دوا کرو۔ اگر جوانی میں عینک لگاؤ گے تو بڑھاپے میں تو ضرور اندھے ہو جاؤ گے''۔

''دیکھو عینک لگوانے کا خیال ترک کر دو۔ آنکھوں میں صبح شام بادام روغن ڈالا کرو۔ اگر دو ہفتوں بعد دن کو تارے نظر نہ آنے لگیں تو چچا افلاطون نام نہیں''۔

''دن کو تارے نظر نہ بھی آئیں تو کوئی مضائقہ نہیں، رات کو نظر آ جائیں تو بھی غنیمت ہے''۔

''نہیں نہیں اپنی قسم، دن کو نظر آئیں گے، آزمودہ نسخہ ہے۔ بس بادام روغن کے تین قطرے صبح اور تین قطرے شام۔ عینک کی ضرورت نہ رہے گی''۔

دو بلکہ چار ہفتے آنکھوں میں روغن بادام ڈالتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رات کے وقت جب چاند کی طرف دیکھتے تو وہ ستارہ نظر آتا تھا اور جب ستاروں کی طرف دیکھتے تو مطلع بالکل صاف۔ اس کے ساتھ سر میں اس قسم کا درد کہ ڈھاڑیں مار مار کر رونے کو جی چاہتا۔ دوبارہ آنکھیں ٹیسٹ کرائیں۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ عینک کا نمبر پہلے کی نسبت بڑھ گیا ہے، اس لیے عینک بنوانے میں مزید دیر نہیں کرنی چاہیے۔ عینک لگوائی لیکن چچا افلاطون اس دن سے ناراض ہیں، کہتے ہیں یا تو تم آنکھوں میں روغن بادام ڈالتے نہیں رہے یا پھر وہ بادام روغن گھٹیا درجے کا تھا۔

ہمارے محلے میں ایک بی۔ اے پاس بے کار نوجوان رہتے ہیں۔ چچا افلاطون کو کسی نے بتایا کہ وہ دو سال سے بے کار ہیں۔ یہ سن کر انہیں بہت افسوس ہوا، اسی دن نوجوان کو گھر بلا بھیجا اور کہنے لگے۔

''تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا کہ اتنے عرصے سے بے کار ہو''۔

نوجوان نے عاجزی سے کہا۔ غلطی ہوئی معاف کر دیجئے''۔

چچا افلاطون نے الماری سے ایک کتاب نکالی دو چار منٹ اس کے ورق الٹتے رہے اور پھر نوجوان سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

''دیکھو برخوردار، مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ بے کار لوگوں کے لیے ہزاروں کام اس کتاب میں درج ہیں۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم مچھلیاں پکڑنا پسند کرو گے یا مینڈک''۔

نوجوان نے حیران ہوتے ہوئے کہ۔ ''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا''۔

''مطلب یہ کہ اگر تم ہر روز پچاس مچھلیاں پچاس مینڈک پکڑ سکو تو انہیں فروخت کر کے کافی روپیہ کما سکتے ہو۔ مچھلیاں تو وہ لوگ خریدیں گے جنہیں کھانے کا شوق ہے اور مینڈک تم ان کالجوں میں فروخت کر سکتے ہو جہاں علم حیوانات پڑھایا جاتا ہے''۔

''معاف کیجئے یہ کام مجھ نہ ہو سکے گا''۔

''خیر کوئی بات نہیں۔ اچھا نہ کرو۔ جنگلی بندر پکڑ لو گے؟''

''جنگلی بندر؟ یہ تو اور بھی مشکل کام ہے''۔

''اچھا اسے بھی رہنے دو۔ تمہارے لیے کوئی اور کام ڈھونڈتے ہیں''۔

چچا افلاطون نے پھر کتاب کھولی اور تھوڑے وقفے کے بعد خوشی سے چلا کر کہا ''مل گیا مل گیا''۔

نوجوان نے کہا ''فرمائیے''

''تم جنگلی شہد اکٹھا کر کے فروخت کیا کرو۔ معقول آمدنی ہو سکتی ہے''۔

نوجوان نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''لیکن یہ تو ذرا ٹیڑھی کھیر ہے''۔

''ذرا بھی ٹیڑھی نہیں''۔ چچا افلاطون بڑے وثوق سے بولے..... ''تم شاید شہد کی مکھیوں سے ڈرتے ہو۔ انہیں بھگانے کی ترکیب میں بتائے دیتا ہوں۔ دیکھ خوب ابلتا ہوا پانی شہد کے چھتے پر ڈال دو۔ تمام مکھیاں چھتے سے گر کر ڈھیر ہو جائیں گی۔ بس اطمینان سے چھتے سے شہد نچوڑو اور بوتل میں بھر لو''۔

☆☆☆

جنگ کی برکتیں

احباب مجھ سے اکثر پوچھتے ہیں کہ میں جنگ کو مصیبت کی بجائے رحمت کیوں سمجھتا ہوں۔ کیا اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ پچھلے دنوں میں نے خوب ہاتھ رنگے ہیں۔ چور بازار میں یا قحط زدہ علاقہ میں چاول کی فروخت سے۔ کیا اس کا سبب یہ تو نہیں کہ مالتھس (Malthus) کی طرح میں جنگ کے وجود کو بڑھتی ہوئی آبادی کے حق میں رحمتِ باری خیال کرتا ہوں۔ اس ضمن میں یہ عرض کرتا ہوں کہ دونوں میں سے کوئی بھی بات نہیں۔ روپیہ میں نے ضرور کمایا ہے لیکن نہایت مشکوک طریقہ سے۔ جنگ کے شروع ہونے کے فوراً بعد میں نے بھانپ لیا تھا کہ جنگ کے دنوں میں زندہ رہنے کا راز اس نکتہ میں مضمر ہے کہ چیزیں خریدنے کے بجائے چیزیں فروخت کی جائیں۔ چنانچہ پچھلے دنوں میں نے قریب قریب گھر کی ہر ایک چیز فروخت کر دی۔ اگر آپ کبھی غریب خانے تشریف لائیں تو آپ کو ایک بوسیدہ دری، چند ضروری برتنوں اور دو ایک چار پائیوں کے علاوہ کوئی اور چیز نظر نہیں آئے گی۔ آپ پوچھیں گے، وہ صوفہ سیٹ، میزیں، کرسیاں، پلنگ اور فانوس کیا ہوئے۔ مثلاً میرے پاس ایک ٹوٹا پھوٹا جاپانی گراموفون تھا جو میں نے داشتہ آید بکار کے مصداق الماری میں رکھ چھوڑا تھا۔ اس کا بھونپو میں کبھی کبھی بیوی کو خواب سے بیدار کرنے کے لیے بجایا کرتا تھا۔ پرسوں میں نے اسے پچھتر روپے میں ایک گراموفون سوداگر کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ پچیس میں لیا تھا۔ پندرہ سال استعمال کیا اور پچاس روپے نفع کمایا۔ تین

ٹانگوں والی کرسی میں نے پندرہ روپے میں فروخت کی اور رسٹ واچ، جو گنتی کے چند پرزوں پر مشتمل تھی، تیس روپے میں اور کتابیں! اب میری لائبریری تقریباً خالی ہو چکی ہے۔ اس میں مولوی عبدالحق کی انگریزی اردو لغت کے علاوہ اور کوئی کتاب نہیں۔ سنا ہے یہ لغات آج کل نایاب ہے۔ اسے بھی عنقریب دگنی تگنی قیمت پر بیچنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔

جنگ نے مجھے ضرورت سے زیادہ موقع شناس بنا دیا ہے۔ جب دیکھتا ہوں لوگوں کو گرم کپڑا نہیں ملتا تو فوراً اپنا گرم کوٹ نیلام گھر بھیج دیتا ہوں۔ جب بازار سے سائیکلیں عنقا ہو جاتی ہیں تو اپنی ٹوٹی پھوٹی سائیکل پالش کرا کے فروخت کر دیتا ہوں۔ پرسوں میں نے اخبار میں اپنے پارکر قلم کا اشتہار دیا۔ آج صبح کی ڈاک سے مجھے تین سو حضرات کے خطوط موصول ہوئے۔ حیرانی ہوتی ہے کہ لوگ اس قلم کو لے کر کیا کریں گے۔ نب گھس چکی ہے۔ پالش اتر گیا ہے۔ لیکن ان نقائص کے باوجود خریدار اسے حاصل کرنے کے لیے بیتاب ہیں۔ دو ایک نے تو لکھا ہے کہ اگر انہیں یہ قلم نہ ملا تو شاید عالمِ مایوسی میں خودکشی کر لیں۔

جنگ کی وجہ سے مجھے چند ایسی مصیبتوں سے رہائی ملی ہے جو بلائے بے درماں کی طرح ہمیشہ میرے ساتھ چمٹی رہتی تھیں۔ مثلاً بیوی کے تقاضے، مہمان، چھوٹے چھوٹے بے معنی اخراجات۔ امن کے زمانہ میں بیوی کے تقاضوں نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ ''اچھا سا شیشہ لا دیجئے''۔ وغیرہ وغیرہ۔ اب جونہی بیوی نے کسی چیز کی فرمائش کی۔ میں نے جھٹ کوئی عذر پیش کر دیا ''کیا کہا آپ نے؟ پاؤڈر چاہیے۔ لیکن جان من ولائتی پوڈر تو کبھی کا عنقا ہو گیا۔ دیسی البتہ ملتا ہے لیکن اس کو لگانے سے چہرے کی جلد پھٹ جاتی ہے۔ کہو تو لا دوں''۔ اور بیوی لمبا سا منہ بنا کر کہتی ہے۔ ''بھاڑ میں جائے ایسا پوڈر''۔ ''ساڑھی چاہیے''، ''لیکن جارجٹ یا کریپ کی ساڑھی آج کل کہاں؟ ذلیل سے ذلیل ساڑھی ڈیڑھ دو سو میں آتی ہے''۔ اور بیوی مایوس ہو کر بڑبڑاتی ہے۔ ''نہ جانے یہ موئی جنگ کب ختم ہو گی۔ جارجٹ کے لیے جی ترس گیا''۔

جنگ کا سب سے بڑا فائدہ پہنچا ہے کہ آئے دن کے مہمانوں سے چھٹکارا ملا۔ جنگ سے پہلے میرا مکان اچھی خاصی کاروان سرائے تھی، جہاں مہمانوں کے قافلے ناگہانی حادثوں کی طرح نازل ہوتے تھے۔ اب جب سے خوراک کا راشن ہوا ہے۔ اول تو کوئی میرے گھر کا رخ نہیں کرتا اور اگر کوئی بھولا بھٹکا آ بھی ٹپکتا ہے تو ایک دفعہ آنے کے بعد دوبارہ آنے کا نام

نہیں لیتا۔ علی الصباح میں اسے دودھ اور چینی کے بغیر چائے پیش کرتا ہوں۔ دو چار گھونٹ زہر مار کرنے کے بعد وہ میرے منہ کی طرف دیکھتا ہے۔ میں کہتا ہوں۔ ''صاحب کیا کریں۔ جنگ کا زمانہ ہے۔ نہ چینی ملتی ہے نہ دودھ''۔ وہ پہر کے کھانے میں اسے کچھ لطف نہیں آتا، جونہی وہ منہ میں پہلا لقمہ ڈالتا ہے۔ ایک آدھ کنکر اس کی داڑھ سے ٹکرا کر ساری بتیسی میں کپکپی سی پیدا کرتا ہے اور وہ بلبلا کر کہتا ہے ''کیسی گندم ہے یہ''۔ میں مسکرا کر جواب دیتا ہوں۔ ''یہ راشن کی گندم ہے۔ دو سال سے یہی کھا رہے ہیں''۔

جنگ کی ایک برکت یہ بھی ہے کہ ایام جنگ میں امن کے زمانہ کی نسبت شانِ وضع داری قائم رکھنا کہیں سہل ہے۔ جنگ سے پہلے محض نمائش پر زر کثیر صرف کرنا پڑتا تھا۔ اب جنگ کی عنایت سے کسی قسم کی نمائش کی ضرورت نہیں۔ پہلے اچھے سے اچھا سوٹ پہن کر کہیں جاتا تھا تو لوگ نظر انداز کر دیتے تھے۔ اب فلالین کی پتلون پہن کر (کہ جس میں تین پیوند لگے ہوئے ہیں) کسی محفل میں شریک ہوتا ہوں تو اسے دیکھ کر احباب کے منہ میں پانی پھر آتا ہے۔ ''اخاہ فلالین کیسے ہاتھ لگی؟'' اور میں منہ پھیلا کر کہتا ہوں۔ ''میرے ماموں کے داماد کے بہنوئی کا سالا محکمہ سول سپلائی میں ملازم ہے۔ اس کی وساطت سے دستیاب ہوئی''۔ جنگ سے پہلے ہر روز ڈاڑھی مونڈنا فیشن میں داخل تھا۔ اب ڈاڑھی مونڈے ہفتے گزر جاتے ہیں لیکن کوئی دوست، اس کوتاہی کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔ ہر ایک جانتا ہے کہ جب اچھے بلیڈ نہیں ملتے تو ڈاڑھی مونڈنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ امن کے زمانے میں جب کبھی بناسپتی گھی کا ڈبا خریدتا تو راہ گیروں کی آنکھ بچا کر ایسے چلتا گویا یہ گھی نہیں بلکہ میری ''منجمد کمینگی'' ہے۔ اب بناسپتی گھی کا کنستر نہایت طمطراق سے گھر میں لاتا ہوں۔ شام کے جھٹپٹے میں نہیں، روز روشن میں اور دیکھنے والے دانتوں میں انگلیاں داب لیتے ہیں۔ ''بناسپتی گھی کا کنستر! ضرور کہیں واقفیت ہوگی''۔

اسے بھی جنگ کی عنایت سمجھئے کہ ہزاروں چھوٹے چھوٹے اخراجات سے نجات ملی۔ راہ چلتے کوئی فقیر پیسے کے لیے درخواست کرتا ہے تو فوراً دھتکار تا ہوں۔ ''جانتا نہیں آج کل ریزگاری نہیں ملتی۔ پیسہ پیسہ چلا رہا ہے''۔ کوئی سادھو آ ٹاما نگنے آتا ہے تو لال لال آنکھیں دکھا کر کہتا ہوں۔ ''معاف کرو بابا۔ آٹا راشن ہو چکا ہے''۔ ایڈیٹر مضمون لکھنے کے لیے کہتے ہیں تو انہیں کہلا بھیجتا ہوں۔ ''نہ سیاہی ہے نہ قلم نہ کاغذ۔ مضمون خاک لکھوں''۔ کوئی پیغام

محبت بھیجتا ہے تو اسے فہمائش کرتا ہوں۔ ''صاحب جنگ کا زمانہ ہے۔ لبوں کے لیے سرخی ملتی ہے نہ آنکھ کے لیے کاجل''۔ مصوری اس لیے نہیں سیکھ سکتا کہ تمام مصور محکمہ پروپیگنڈا میں چلے گئے۔ مطلب یہ کہ بہر ملاقات کوئی بھی تو تقریب نہیں۔ کچھ دن اور صبر کیجئے۔ شاید جنگ کے بعد کوسمیل نکل آئے''۔

الغرض جنگ کی برکتوں کو کہاں تک گنواؤں۔ دفتر چاہئے۔ اور جنگ کے دنوں میں دفتر تو ہزاروں کھل گئے ہیں لیکن کاغذ ابھی تک کنٹرول ہے۔

☆☆☆

واقفیت

چند دن ہوئے ایک بزرگ گاؤں سے تشریف لائے۔ کہنے لگے ''خان اکڑباز خان سب انسپکٹر فلاں پولیس اسٹیشن کو جانتے ہو؟ میں نے کہا۔ ''نہیں'' حوالدار تلوار سنگھ سے تعارف ہے؟ ''نہیں'' شام لال سپاہی کو جانتے ہو؟'' ''نہیں''۔ جھلا کر فرمانے لگے۔ ''بیڑا غرق!'' میں نے پوچھا۔ ''کس کا؟'' فرمایا۔ ''میرا، تمہارا اور اختر کا''۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔ ''بات کیا ہے؟'' انہوں نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ ''اختر کی عادات سے تم بخوبی واقف ہو۔ آتے دن جھگڑا مول لینا اس کا خاصہ ہے۔ پرسوں اپنے سپرنٹنڈنٹ پر چاقو سے حملہ کر دیا۔ پولیس تفتیش کر رہی ہے۔ میں نے سوچا۔ تمہاری پولیس والوں سے راہ و رسم ہوگی اور مل کر معاملہ رفع دفع ہو جائے گا۔ لیکن تم نے تو لٹیا ہی ڈبو دی''۔ میں نے متانت سے کہا۔ ''لاہور میں صرف دو آدمیوں کو جانتا ہوں۔ ایک ہے ماتا دین پنواڑی اور دوسرا چنجی لال دھوبی''۔ انہوں نے ایک بار پھر زور سے کہا۔ ''بیڑا غرق'' اور تشریف لے گئے۔ تین ہفتوں کے بعد پھر میرے پاس آئے اور پوچھنے لگے۔ ''ہیرا لال سب جج کو جانتے ہو؟'' ''نہیں'' ''موتی لال ریڈر سے جان پہچان ہے؟'' ''نہیں''۔ ''چاندی رام چپڑاسی سے سفارش کر سکتے ہو؟'' ''نہیں''۔ طیش میں آ کر انہوں نے اپنا تکیہ کلام دہرایا اور چلے گئے۔

ان کے چلے جانے کے بعد مجھے اپنی محدود جان پہچان پر واقعی تعجب ہوا۔ میں نے سوچا۔ آج تو اختر کا معاملہ ہے۔ کل اگر اپنے آپ پر مصیبت بن جائے تو۔ بہت کچھ سوچنے کے بعد

اس نتیجہ پر پہنچا کہ واقفیت کا دائرہ وسیع کیا جائے۔ میرے محلے میں ایک سب جج رہتے ہیں۔ میں نے سوچا چلو واقفیت کی بسم اللہ ان سے ہی کی جائے۔ ایک اتوار کی صبح کو ان کی کوٹھی پر حاضر ہوا۔ کارڈ بھیجا۔ ویٹنگ روم میں جہاں بہت سے ملاقاتی تشریف فرما تھے بٹھایا گیا۔ اخبارات کی ورق گردانی کی۔ جمائیاں لیں، ایک پیکٹ سگرٹوں کا ختم کیا، دربان کی مت سماحت کی۔ آخر جب سب ملاقاتی ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے تو میری باری آئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی آداب بجالایا۔ سب جج صاحب نے عینک اتاری۔ ایک سیکنڈ کے لیے میری طرف دیکھا۔ عینک لگالی۔ کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر عینک اتاری اور فرمایا۔ ''کہیئے'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''فرمایئے''۔

''کیسے آنا ہوا؟

''یونہی''۔

چند لمحے ہم دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ یکلخت مجھے خیال آیا کہ اب موضوع بدلنا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے کہا:

''بہت گرمی پڑ رہی ہے''۔

''ہوں''۔

''لاہور کی گرمی سے خدا بچائے''۔

''ہوں''۔

''لیکن جناب لاہور کی سردی تو گرمی سے بھی زیادہ اذیت بخش ہوتی ہے''۔

''ہوں''۔

''لاہو کی برسات کے کیا کہنے!''۔

انہوں نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا۔ ''اب صرف موسم خزاں رہ گیا۔ اس کے متعلق بھی کچھ کہہ ڈالیے''۔

میں نے عاجزی سے کہا۔ ''بندہ پرور! موسم بہار کو تو آپ بھول ہی گئے''۔ چند سیکنڈ پھر خاموشی رہی۔ میں نے سوچا۔ اب پھر موضوع بدلنا چاہیے۔

''آخر جنگ ختم ہو ہی گئی''۔

''جی ہاں''۔

''آخر ہٹلر مر ہی گیا''۔

''جی ہاں''۔

''آخر آسٹریلین ٹیم میچ جیت ہی گئی''۔

انہوں نے تنگ آ کر کہا۔ ''کام کی بات کیجئے''۔

میں نے انکساری سے جواب دیا۔ ''اگر میری باتیں پسند نہیں تو آپ ہی کوئی قصہ سنائیے''۔

''میں آپ کی طرح بیکار نہیں''۔

میں نے بے تکلفی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''یوں کہئے کہ آپ کو باتیں بنانی نہیں آتیں''۔

انہوں نے جھنجھلا کر فرمایا۔ ''آپ کا مطلب؟''۔

''کچھ نہیں''۔ میں نے بات ٹالتے ہوئے جواب دیا۔ سنئے میں آپ کو ایک نہایت دلچسپ بات سناتا ہوں۔ ہمارے محلّہ میں، میرا مطلب ہے جس محلّہ میں آپ بھی رہتے ہیں۔ ماتا دین پنواڑی کی دکان ہے۔ اس کے پاس ایک بکری ہے۔ جس کی پانچ ٹانگیں ہیں۔ آپ نے شاید بکری نہیں دیکھی۔ سنا ہے یہ بکری تین سیر دودھ .....''

''معاف کیجئے۔ میرے پاس فضول باتوں کے لیے وقت نہیں۔ آپ تشریف لے جائیے''۔

''ضرور ضرور۔ لیکن گاہے گاہے ملا کیجئے۔ میرا مکان نزدیک ہی ہے ماتا دین پنواڑی سے پوچھ لیجئے گا''۔

انہوں نے زیر لب کچھ کہا۔ میں نادم سا ہو کر کمرے سے باہر چلا آیا۔ سب جج صاحب کے ہاں دال گلتی نہ دیکھ کر میں نے پولیس سٹیشن کا رخ کیا۔ سوچا پولیس والے بڑے کام کے آدمی ہوتے ہیں، ان سے ہی دوستی گانٹھی جائے۔ پولیس سٹیشن کے قریب پہنچا۔ دیکھا کہ ایک سپاہی بندوق اٹھائے پہرہ دے رہا ہے۔ دو سپاہی ایک ملزم کی مرمت کر رہے ہیں اور ایک حوالدار ایک ستے کو گالیاں دے رہا ہے۔ دفتر میں داخل ہوا۔ ہیڈ کلرک کو سلام کیا۔ انہوں نے پتھر کھینچ مارا۔ ''آپ کون ہیں۔ یہاں کیوں آئے ہیں''۔ عرض کیا۔ انسپکٹر صاحب سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ پوچھا۔ ''آپ کا نام؟'' نام بتایا۔ پھر پوچھا۔ ''باپ کا نام۔ ذات پیشہ۔

سکونت''۔ میں نے کہا۔ تفاصیل میں مت جائیے۔ میں صرف دو چار منٹ کے لیے انسپکٹر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ ارشاد ہوا ''انسپکٹر صاحب چند معزز شہریوں سے گفتگو کر رہے ہیں۔ اس لیے آدھ گھنٹہ سے پہلے نہیں مل سکتے''۔ میں دفتر میں بیٹھ گیا اور ادھر ادھر جھانکنے لگا۔ بائیں دیوار پر پندرہ بیس ہتھکڑیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ دائیں دیوار پر تختۂ سیاہ پر حوالات میں قیدیوں کی تعداد لکھی ہوئی تھی۔ سامنے کی دیوار پر ان لوگوں کی تصویریں فریم میں لگی ہوئی تھیں جو مختلف جرائم کا ارتکاب کرنے کے بعد روپوش ہیں اور جن کی گرفتاری کے لیے گورنمنٹ نے انعامات مقرر کر رکھے ہیں۔ ایک بات رہ رہ کر میرے دل میں کھٹک رہی تھی۔ ان میں سے بہتوں کا حلیہ مجھ سے ملتا جلتا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ اگر انسپکٹر صاحب کو شک پڑ گیا تو، اتنے میں ہیڈ کلرک نے کہا۔ ''اب آپ اندر جا سکتے ہیں''۔

انسپکٹر صاحب کو جھک کر سلام کیا اور گفتگو کا آغاز اس فقرہ سے کیا۔ ''انسپکٹر صاحب آپ کا بھی عجیب پیشہ ہے۔ ہمیشہ چوروں اور بدمعاشوں سے پالا پڑتا ہے''۔ وہ کچھ ناراض سے ہو گئے اور کہنے لگے۔ ''ہمیشہ نہیں۔ ابھی آپ کے آنے سے پہلے میں چند نہایت معزز لوگوں سے بات چیت کر رہا تھا''۔

میں نے آہستہ سے کہا۔ ''میں محکمہ تعلیم میں ملازم ہوں۔ محکمہ تعلیم شریف ترین محکمہ ہے''۔ ''آپ یہاں کیسے تشریف لائے؟''

''انسپکٹر صاحب، میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں، فرض کیجئے میرا کوئی دوست ہنسی مذاق میں، میرا مطلب ہے غصہ کی حالت میں قتل کر بیٹھے تو آپ اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے''۔

''میں اسے زیر دفعہ 302 تعزیراتِ ہند گرفتار کر لوں گا''۔

''دیکھئے انسپکٹر صاحب خدا کے لیے ایسا نہ کیجئے۔ کم از کم اس بات کا لحاظ کیجئے گا کہ وہ میرا دوست ہے۔ میں محکمہ تعلیم میں ملازم ہوں اور محکمہ تعلیم شریف ترین.....''

''فرض، فرض ہے''۔ انہوں نے گرج کر فرمایا۔

''سنئے انسپکٹر صاحب۔ وعدہ کیجئے کہ آپ اسے کچھ نہیں کہیں گے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ پرنسپل صاحب سے سفارش کر کے آپ کے لڑکے کی آدھی فیس معاف کرا دوں گا''۔

''مجھے ایسی خیرات کی ضرورت نہیں۔ آپ مجھے یہ بتایئے کہ قاتل کون ہے، اس وقت کہاں ہے اور جرم کس جگہ سرزد ہوا''۔

''انسپکٹر صاحب! آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ واللہ میں تو ناکردہ جرائم کا ذکر کر رہا ہوں اور آپ ملزم کو پھانسی پر لٹکوانے کے خواب دیکھ رہے ہیں''۔

''اگر یہ بات ہے تو آپ خوامخواہ میرا وقت ضائع کر رہے ہیں''۔

''اچھا سنئے میں کوشش کر کے ساری فیس معاف کرادوں گا۔ کہئے یہ سودا منظور ہے''۔

فضول باتیں نہ بنایئے اور پولیس سٹیشن سے فوراً باہر چلے جایئے''۔

پولیس سٹیشن سے واپس گھر آ رہا تھا۔ راستے میں پاگل خانہ پڑتا تھا۔ میں نے خیال کیا، چلو پاگل خانے کے سپرنٹنڈنٹ صاحب ہی سے واقفیت پیدا کی جائے۔ کیا معلوم کوئی دوست کسی وقت پاگل ہو جائے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب سے ملنے پر ابھی میں حرفِ مطلب زبان پر لایا ہی تھا کہ ایک ملازم نے آ کر کہا۔ جناب نمبر پچیس تین گھنٹے سے چلا رہا ہے۔ میں پان کا بیکہ ہوں۔ کیا کیا جائے''۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے با آواز بلند فرمایا۔ ''اس حرامی کو کوڑے لگاؤ۔ درست ہو جائے گا''۔ اتنے میں ایک ملازم یہ سندیسہ لایا۔ ''حضور نمبر بتیس نے سلاخوں کے ساتھ سر پٹخ پٹخ کر اپنے آپ کو لہولہان کر لیا ہے''۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے فرمایا۔ ''اس کی مشکیں اور کس دو اور ہسپتال میں پہنچا دو''۔

یہ حکم صادر کرنے کے بعد میری طرف متوجہ ہوئے۔ ''آپ کیسے تشریف لائے۔ کسی عزیز سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں''۔

میں نے کہا۔ ''میں آپ سے ملنے آیا ہوں''۔

''فرمایئے''۔

''سپرنٹنڈنٹ صاحب اگر میرا کوئی ''ادیب'' دوست پاگل ہو جائے اور پکارنا شروع کر دے۔ میں پریم چند ہوں، میں ٹیگور ہوں، میں کالی داس ہوں تو آپ اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے''۔

میں اسے پیار سے سمجھاؤں گا کہ عزیز تم پریم چند نہیں۔ دنی چند ہو''۔

''اگر وہ نہ مانے''۔

''تو میں اسے کوڑے لگاؤں گا''۔

''ایسا غضب نہ کیجئے سپرنٹنڈنٹ صاحب۔ ادیب تو پہلے ہی ادھ موئے ہوتے ہیں''۔

''آپ کو شاید علم نہیں کہ پاگل آدمی صرف چابک سے ڈرتا ہے''۔

''کیا آپ یہ نہیں کر سکتے کہ اسے شمس العلماء یا مہا مہوپادھیائے کا خطاب دلا دیں''۔

''آپ عجیب باتیں کرتے ہیں''۔

''میں عجیب باتیں کرتا ہوں یا آپ۔ ذرا کسی سے پوچھئے تو''۔

''کس سے پوچھوں؟ یہاں سب پاگل رہتے ہیں''۔

''پاگل لوگ بڑے ذہین ہوتے ہیں سپرنٹنڈنٹ صاحب۔ شیکسپیئر نے کہا ہے۔ عشاق، شاعر اور پاگل ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں''۔

سپرنٹنڈنٹ صاحب نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا۔ ''ہوں! ذرا میرے قریب آیئے اور مجھے اپنی آنکھوں میں ایک منٹ کے لیے جھانکنے دیجئے''۔

میں نے کہا۔ ''اجی میں کس لائق ہوں۔ اگر آپ کو واقعی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی حرص ہے تو کسی بہتر شخص سے آنکھیں لڑایئے''۔

سپرنٹنڈنٹ صاحب پینترا بدل کر کہنے لگے۔ ''آپ کا شغل''۔

''معلم ہوں''۔

''کتنے گھنٹے کام کرتے ہیں؟''۔

''بارہ گھنٹے''۔

''دودھ پیتے ہیں؟''۔

''کبھی کبھی''۔

''نیند کا کیا حال ہے؟''۔

''جس دن پانچ پیریڈ (Period) پڑھاؤں۔ نیند نہیں آتی''۔

''ہم۔ مجھے پہلے ہی شک تھا''۔

یہ کہہ کر انہوں نے زور سے گھنٹی بجائی۔ ایک ملازم بھاگا ہوا آیا۔ میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگے۔ ''انہیں پہچانتے ہو؟ میرا خیال ہے یہ وہی شخص ہیں جو گذشتہ سال کمرہ نمبر چالیس

سے بھاگے تھے''۔

ملازم نے غور سے مجھے دیکھنے کے بعد فیصلہ دیا کہ میں چالیس نمبر سے ملتا جلتا ضرور ہوں لیکن چالیس نمبر نہیں ہوں''۔

سپرنٹنڈنٹ صاحب نے کہا''آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔ دیکھئے کام کی مقدار ذرا کم کر دیجئے گا''۔

گھر میں داخل ہونے سے پہلے ایک لحظہ کے لیے میں ماتا دین پنواڑی کی دکان پر رکا۔ ماتا دین نے کہا۔

''کہئے کیا حال ہے؟''۔

''آپ کی دعا ہے۔ بکری کا کیا حال ہے؟''۔

''اجی صاحب! بکری تو کمال کر رہی ہے۔ اب سوا تین سیر دودھ دیتی ہے''۔

''واقعی''۔

''ہاں صاحب! لیکن آپ کی آنکھیں کیوں لال ہو رہی ہیں''۔

''دھوپ میں چلتا رہا ہوں''۔

''نہیں صاحب یہ بات نہیں۔ آپ کا جگر بڑھ گیا ہے۔ بکری کا دودھ پیا کیجئے۔ کہو تو بھجوا دوں''۔

''ضرور ضرور''۔

''ہاں صاحب۔ صحت کا ضرور خیال رکھا کیجئے گا۔ صحت نہیں تو کچھ بھی نہیں''۔

☆☆☆

نٹ راج

کیلاش پربت پر بیٹھے ہوئے نٹ راج نے پاربتی سے کہا۔''میں فنا کا دیوتا ہوں، مجھے خاموشی اور سکون سے نفرت ہے، مسکراہٹوں اور قہقہوں کی بجائے مجھے چیخ و پکار اور نالہ و شیون میں زیادہ لطف آتا ہے، مسلسل جمود سے میری طبعیت گھبرا سی جاتی ہے۔ میں چاہتا ہوں، زلزلے، طوفان، چیخیں، غلغلے اور پھر پچھلے پچیس سال سے دنیا میں کوئی دھما کا بھی تو نہیں ہوا''۔

پیشتر اس کے کہ پاربتی نٹ راج کی بات سمجھ سکتی، اس نے اٹھ کر تانڈو ناچ شروع کر دیا۔ یکایک اس کی آنکھوں میں میں شعلے لپکے۔ جٹاؤں میں گتھے ہوئے سانپ پھنکارنے لگے۔ گلے میں لٹکی ہوئی کھوپڑیوں نے خوفناک قہقہے لگائے۔

دھم! دھم! دھم! دھادھم!! نٹ راج ناچ رہا تھا۔ معاً ہزاروں پہاڑ ٹینکوں کی شکل میں ایک دوسرے سے ٹکرائے، ہزاروں بجلیاں آگ اور بارود کی صورت میں کوندیں، ہزاروں بادل ہوائی جہاز بن کر فضا میں منڈلائے اور پولینڈ کی راجدھانی وارسا پر بموں کا مینہ برسنے لگا۔ لاکھوں پول بچے، عورتیں اور بوڑھے، بھاری بھرکم گرڈروں، اینٹ اور سیمنٹ کے مکانوں، وزنی سلاخوں اور پتھر کے نیچے سسک سسک کر دم توڑنے لگے۔ سرد آہوں، فلک شگاف چیخوں اور مغموم التجاؤں کے قافلے کیلاش پربت کو چھوتے ہوئے برف کے تودوں میں بھٹک گئے نٹ راج کے چہرہ پر مسکراہٹ کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ اس نے اور تیزی سے ناچنا شروع کر دیا۔

''دھم! دھم! دھادھم''۔ پاربتی نے کیلاش پربت سے جھانک کر دیکھا۔ فرانس کے خوبصورت شہروں پر اولوں کی طرح بم برس رہے تھے۔ چشمِ زدن میں فرانس کا حسن، فرانس کا آرٹ، فرانس کے نغمے بلبلوں کے ڈھیروں اور بارود کے شعلوں کی نذر ہو گئے۔

اگلے لمحے میں پاربتی نے دنیا کے سب سے بڑے شہر لندن کو جلتے ہوئے دیکھا۔ آگ کے شعلے کیلاش پربت کی طرف لپک رہے تھے۔ پاربتی کو یوں محسوس ہوا جیسے مغربی تہذیب نے خودکشی کرنے کے لیے لندن کے وسط میں بڑی بھاری چتا روشن کی ہے۔

حدِ نظر تک آگ اور دھوئیں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھی انسانوں کے سر، بازو، ٹانگیں اور دھڑ، ہوا میں اڑتے دکھائی دیتے۔ دھواں گہرا ہو رہا تھا۔ چند لمحوں میں اس دھوئیں کو بموں کی خوفناک آوازوں، مشین گنوں کے دھڑ دھڑاتے ہوئے گولوں، انسانوں کی روح فرسا چیخوں نے اتنا بوجھل بنا دیا کہ پاربتی کا دم گھٹنے لگا۔

''بند کرو نٹ راج! بند کرو یہ خوفناک ناچ''۔ پاربتی نے چلا کر کہا۔

''ہاہاہا..... ہاہاہا.....'' نٹ راج نے ایک بلند قہقہہ لگایا اور پہلے سے زیادہ جوش کے ساتھ ناچنے لگا۔ بارود کا لاوا خشکی اور تری کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہوا تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھنے

لگا۔نٹ راج کی جٹاؤں سے خون ٹپکنے لگا۔صحراؤں کی ریت خون سے بھیگ کر لال ہوگئی۔ سمندروں میں خون کے طوفان اٹھے۔ چاروں طرف آگ ہی آگ۔ دھواں ہی دھواں اور خون ہی خون نظر آنے لگا۔

''شنکر!'' پاربتی نے ایک دفعہ اور چیخ کر کہا۔''ناچ بند کرو''۔

نٹ راج ایک لمحہ کے لیے رکا۔اس نے پاربتی کو مخاطب کیا۔''پاربتی تم نہیں جانتیں کہ دنیا کو تباہی کی کتنی ضرورت ہے۔ ادھر چند سالوں سے برہما نے ہزاروں نا اہل، بے سمجھ اور بے مصرف آدمی پیدا کر دیئے ہیں۔ اگر دنیا کی آبادی اسی رفتار سے بڑھتی رہی تو بے چارہ وشنو جس نے کندھوں پر برہما کی مخلوق کی پرورش کی ذمہ داری لی ہے، عجیب مخمصے میں پڑ جائے گا''۔

دھم دھما۔دھم دھما دھم'' نٹ راج نے پھر ناچنا شروع کر دیا۔لینن گراڈ، ماسکو، سالن گراڈ، طبروق، مالٹا، سنگاپور، مانڈلے اور رنگون میں حشر برپا ہوا۔گرجوں، مندروں اور پیگوڈوں کے کلس ٹوٹ ٹوٹ کر زمین پر آ رہے۔ پل، ریلوے لائنیں اور کارخانے ریزہ ریزہ ہو کر ہوا میں اچھلے۔ پاربتی نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔نٹ راج کا ناچ اپنے شباب پر تھا۔ زمین کانپ رہی تھی۔انسان گھبرایا اور سہما ہوا انسان شنکر کا واسطہ دے کر پکار رہا تھا'' ہے شوشنکر! نیک کنٹھ ہے ترلوکی کے ناتھ دیا کرو، دیا کرو'' لیکن نٹ راج اپنے ناچ میں اتنا منہمک تھا کہ یہ آوازیں صدا بصحرا بن کر رہ گئیں۔نٹ راج کا ناچ دلکش سے دلکش تر ہوتا گیا اور زمین پر رہنے والوں پر سخت سے سخت تر آفتیں اور بلائیں نازل ہوتی گئیں۔گرانی، راشن سسٹم، بھوک، قحط اور زمین سے آہ و فریاد کا غلغلہ اٹھا۔

''میرا اکلوتا بیٹا!''

''میرا لال!''

''میری عصمت مٹھی بھر چاولوں کے عوض خرید لو''۔

''لوگو میں لٹ گئی۔میرا بچہ سسک سسک کر مر گیا''۔

پاربتی نے یہ آوازیں سنیں۔اس کی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔نٹ راج نے ایک اور قہقہہ لگایا، سہمی ہوئی مخلوق اور سہم گئی۔

معصوم چینی دوشیزاؤں کی عصمتیں لٹیں۔

لہلہاتی ہوئی کھیتیاں شعلوں کی نذر ہوئیں۔
بوڑھے اور بچے بے دردی سے قتل کیے گئے۔

پاربتی سے نہ رہا گیا۔ اس نے نٹ راج سے آخری بار ناچ بند کرنے کی درخواست کی۔ نٹ راج کی وارفتگی اب جنون کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ وہ ناچ میں نئی نئی جدتیں پیدا کر رہا تھا۔ پاربتی کو محسوس ہوا کہ اگر تانڈو ناچ چند منٹ اور جاری رہا تو دنیا ختم ہو جائے گی۔ وہ اٹھی اور نٹ راج کو خوش کرنے کے لیے اس کی آرتی اتارنی شروع کی۔ ''دھن دھن مہادیو۔ جے جے مہادیو۔ دھن دھن مہادیو.....''

نٹ راج نے مسرت سے چلا کر کہا۔ ''نہیں پاربتی، یہ ناچ بند نہیں ہو سکتا۔ جب تک انسان درندہ رہے گا، جب تک وہ آگ اور بارود کے شعلوں سے کھیلتا رہے گا، جب تک اسے زر اور زمین کی ہوس رہے گی، جب تک وہ انسانی خون کی قدر نہیں کرے گا۔ یہ ناچ جاری رہے گا ہاہاہا..... میں نسل انسانی کو ختم کر کے دم لوں گا۔ یہ خون کی پیاسی نسل، یہ بھیڑیوں اور چیتوں کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹنے والی نسل۔ میں اسے آگ کے شعلوں میں بھسم کر دوں گا اور اس کی راکھ سے ایک نئی نسل کی تخلیق کروں گا۔ ایک نئی نسل، جو شاید ہوائی جہاز اور بمبار نہ بنا سکے۔ لیکن جو اس زخمی اور جھلسی ہوئی زمین پر ایک نئی بہشت کی بنیاد رکھ سکے۔

پاربتی نے نٹ راج کی بات کی کچھ پروا نہ کی۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنا سر نٹ راج کے قدموں پر رکھ دیا اور دوسرے لمحے میں اس نے نٹ راج کے پاؤں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ایک پراسرار اور سحر آفرین مسکراہٹ اس کی طرف پھینکی اور کہا۔ ''میرے بھولے مہادیو! تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ صرف انسان ہی وہ جانور ہے جو تجربے سے کبھی فائدہ نہیں اٹھاتا۔ اس سے پہلے بھی کئی بار تم اس کی خصلت بدلنے کی ناکام کوشش کر چکے ہو۔ لیکن نتیجہ؟ چھوڑو، یہ بے سود باتیں، یہ جانور کبھی سدھر نہیں سکتا، یہ جانور کبھی نہیں سدھرے گا..... آؤ کیلاش پربت پر چاند اور ستاروں کو آپس میں آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے دیکھیں''۔

☆☆☆

پریس کانفرنس

افراد حضور لیڈر

حضور لیڈر کا پرائیوٹ سیکرٹری

اخباری نمائندے

مقام حضور لیڈر کی کوٹھی

پرائیوٹ سیکرٹری: (اخباری نمائندوں سے) آپ لوگ آ گئے۔ شکریہ۔ آپ تھوڑی دیر انتظار فرمائیں۔ حضور لیڈر امریکہ کی ایک مشہور انشورنس کمپنی کے ایجنٹ سے بات چیت کر رہے ہیں۔

ایک نمائندہ: انشورنس کمپنی کے ایجنٹ سے؟

سیکرٹری: جی ہاں۔ لیکن یہ مت پوچھئے کس موضوع پر!

دوسرا نمائندہ: کیا میں آپ سے درخواست کر سکتا ہوں کہ حضور لیڈر کے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے آپ ان کے سیاسی پروگرام پر روشنی ڈالیں۔

سیکرٹری: میں ان کے سیاسی پروگرام کے متعلق زیادہ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ ضرور کہوں گا کہ حضور لیڈر نہایت مصروف آدمی ہیں۔ ہر روز تقریباً ایک درجن بیانات اخبارات کو دیتے ہیں، ایک درجن بیانات کی تردید کرتے ہیں، ان دنوں حضور وائسرائے سے خط کتابت کر رہے ہیں اور عنقریب وزیر ہند سے ملنے کے لیے لندن جا رہے ہیں۔

ایک نمائندہ: اچھا تو حضور لیڈر لندن بھی جا رہے ہیں؟ کب؟

سیکرٹری: وقت آنے پر اس امر کا اعلان اخبارات میں کر دیا جائے گا..... اچھا یہ لیجئے حضور لیڈر کی فوٹو کا پیاں۔ انہیں آپ اخبارات میں چھاپ سکتے ہیں۔ اس بات کا ذرا خیال رکھیے گا کہ فوٹو اخبارات کے پہلے صفحہ پر ہو۔ ایک اور درخواست آپ سے کرنا چاہتا ہوں۔ کانفرنس کے دوران میں کوئی شخص حضور لیڈر سے پریشان کن سوالات نہ کرے۔

نمائندہ: آپ کا مطلب؟

سیکرٹری: میرا مطلب ہے اس قسم کے سوال کہ ''آپ نے سیاسیات کی باقاعدہ تعلیم کہاں

حاصل کی؟ آپ اپنے آپ کو مہاتما گاندھی، مسٹر چرچل اور جوزف سٹالن سے کیوں افضل سمجھتے ہیں؟، آپ جیل جانے سے کیوں ڈرتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔"

ایک نمائندہ: کیا ہم ان کے بیان پر نکتہ چینی کر سکتے ہیں؟

سیکرٹری: میرے خیال میں نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ حضور لیڈر نکتہ چینی سے بہت گھبراتے ہیں۔ چند دن ہوئے ایک اخبار نے ان کا ایک کارٹون چھاپا جس میں ان کے چہرے کو الو سے مشابہت دی گئی۔ حضور لیڈر اس کارٹون کو دیکھ کر اتنے تلملائے کہ انہوں نے اس اخبار کے نمائندہ کو پچھلی پریس کانفرنس سے کان سے پکڑ کر باہر نکال دیا۔

ایک نمائندہ: کیا حضور لیڈر اتنے زود رنج واقع ہوئے ہیں؟

سیکرٹری: زود رنج نہیں بلکہ حساس۔ بلکہ یوں کہئے۔ لیجئے وہ تشریف لا رہے ہیں۔

(تمام نمائندے کھڑے ہو کر استقبال کرتے ہیں)

حضور لیڈر: تشریف رکھیے، مجھے افسوس ہے کہ آپ کو اتنی دیر انتظار کرنا پڑا۔

ایک نمائندہ: کوئی مضائقہ نہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ آپ نہایت اہم گفتگو کر رہے تھے۔

حضور لیڈر: جی ہاں نہایت اہم گفتگو، میرا خیال ہے اس گفتگو کے شائع ہوتے ہی دنیا میں تہلکہ مچ جائے گا۔ پچھلی نصف صدی میں اس سے زیادہ اہم گفتگو شائع نہیں ہوئی۔

ایک نمائندہ: کیا میں پوچھنے کی جرات کر سکتا ہوں کہ اس گفتگو کی نوعیت کیا ہے؟

حضور لیڈر: یہ گفتگو ابھی صیغۂ راز میں ہے۔ میں آپ کو اس کے علاوہ کچھ نہیں بتا سکتا کہ یہ نہایت اہم گفتگو ہے..... ہاں اور میں گذارش کروں گا کہ آپ اس قسم کے سوال اگر مجھ سے نہ کریں تو اچھا رہے گا۔ میرا خیال ہے۔ میرے سیکرٹری نے آپ کو تمام ہدایات دے دی ہیں۔

سیکرٹری: جی ہاں، میں نے انہیں سب باتیں سمجھا دی ہیں۔

ایک نمائندہ: کیا حضور لیڈر اس "اہم گفتگو" کا انکشاف اگلی پریس کانفرنس میں کریں گے؟

حضور لیڈر: ہو سکتا ہے شاید۔ نہیں، ہاں، لیکن ابھی یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ خیر تو جس مطلب کے لیے آپ لوگوں کو تکلیف دی گئی ہے، وہ ہے ہندو مسلم اتحاد کے متعلق میرا تازہ ترین فارمولہ، میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ اس فارمولہ کی نشر و اشاعت میں میرا ہاتھ بٹائیں۔ میرا مطلب ہے کہ میرے ساتھ پورا تعاون کریں کیونکہ یہ ایک نہایت اہم مسئلہ ہے۔ مسئلہ سے

زیادہ اہم فارمولا ہے جسے میں نے دس برس کی متواتر دماغ سوزی کے بعد تیار کیا ہے (ماتھے سے پسینہ پونچھ کر) خدا بہتر جانتا ہے مجھے کس قدر کاوش کرنا پڑی۔ لیکن خالقِ دو جہاں کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری محنت پھل ہوئی اور میں اس پیچیدہ مسئلہ کی پیچیدہ گتھی کو سلجھانے میں کامیاب ہو گیا۔ جو بات مہاتما گاندھی کو نہ سوجھی، جس راز کو ابوالکلام آزاد نہ پا سکے، جس معما نے بڑے بڑے سیاستدانوں کو چکرا دیا، جس سوال نے ہر محبِ وطن کا دم ناک میں کر رکھا ہے، اس کا حل سوچنے میں یہ خاکسار کامیاب ہوا۔ سچ کہا ہے کسی نے ع

این سعادت بزورِ بازو نیست

ایک نمائندہ: حضور بجا فرماتے ہیں۔ سیاسی گتھیوں کو سلجھانا ہر ایک لیڈر کے بس کی بات نہیں۔

حضور لیڈر: ہندوستان میں لیڈر ہیں ہی کتنے۔ میں سچ کہتا ہوں۔ ہندوستان میں اتنے لیڈر بھی نہیں جتنے انگلستان میں ذہین آدمی۔ یا در کھیے۔ کھدر پہننے یا چرخہ کاتنے سے انسان لیڈر نہیں بن سکتا۔ ہتھکڑی لگوانے سے "سی کلاس" مل سکتی ہے۔ لیڈری نہیں۔ لیڈری کا ملکہ خداداد ہے۔ لیڈر شاعروں کی طرح پیدا ہوتے ہیں، بنائے نہیں جاتے۔ میری طرف دیکھئے۔ لیڈری میری گھٹی میں پڑی ہے۔ کالج میں سب سے زیادہ سٹرائکس (Strikes) میں نے کرائیں، کلب میں سب سے زیادہ جھوٹ میں بولتا ہوں، ایڈیٹر بن کر سب سے زیادہ چندہ میں نے ہضم کیا۔ حضرات! لیڈر بننے کے لیے بہت سی باتوں کی ضرورت ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ صرف لیاقت سے کام چل جاتا ہے۔ خیر یہ جملہ معترضہ تھا۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا۔

ایک نمائندہ: آپ فرما رہے تھے کہ آپ نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے ایک نیا فارمولا تیار کیا ہے۔

حضور لیڈر: ہاں یہ فارمولا بالکل نیا ہے۔ میرا مطلب ہے آج تک کسی لیڈر کے ذہن میں نہیں آیا۔ اس فارمولے میں نکتہ یہ ہے کہ اسے ہندو اور مسلمان دونوں پسند کریں گے۔ یہ فارمولا میرے تمام گذشتہ فارمولوں پر سبقت رکھتا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا سن انیس سو اکتالیس میں، میں نے ایک فارمولا ایجاد کیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ ہندو مسلم سوال کا بہترین حل یہ ہے کہ یا تو بیس کروڑ مسلمان دیگر ممالک سے ہندوستان لائے جائیں یا بیس کروڑ ہندو ممالکِ غیر کو بھیجے جائیں تاکہ ہندو مسلم تناسب پچاس پچاس فی صد ہو جائے لیکن یہ فارمولا لوگوں نے پسند نہ کیا۔ سن انیس سو چوالیس میں میں نے دوسرا فارمولا تیار کیا۔ میں نے کہا کہ ہندو اور مسلمان باری

باری ہندوستان پر راج کریں۔ مثلاً پہلے پانچ سال کے لیے ہندو دست بردار ہو جائیں۔ علیٰ ہذا القیاس۔ لیکن یہ فارمولا بھی روک دیا گیا۔ اب سن انیس سو چھیالس میں، میں نے تیسرا فارمولا تیار کیا ہے۔ یہ فارمولا اس مسئلہ کا بہترین حل ہے۔

ایک نمائندہ: قطع کلام معاف۔ لیکن اس فارمولا کی وضاحت فرما دیجئے۔

حضور لیڈر: میں اب وضاحت کی طرف آ رہا ہوں۔ میں سچ کہتا ہوں۔ یہ فارمولا انتادل آویز ہے کہ مجھے اپنے آپ پر رشک آتا ہے، کئی بار جب میں اس فارمولے کے باریکیوں پر غور کرتا ہوں تو مسرت سے چیخ اٹھتا ہوں۔ میں واقعی خوش نصیب ہوں۔ بات پھر بات میں کھو گئی۔ ہاں تو آپ لوگوں کو اس فارمولے کی وضاحت درکار ہے۔ اچھا تو سنئے۔ میرے خیال میں ہندو مسلم اتحاد اس لیے نہیں ہوتا کیونکہ ہندو اور مسلمان اتحاد نہیں چاہتے۔ مسلمان، ہندوؤں کو شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ہندو، مسلمانوں سے بدظن ہیں۔ مسلمانوں کا خیال ہے کہ اگر ہندو راج قائم ہو گیا تو اسلامی تہذیب اور تمدن کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ اگر حکومت کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ آ گئی تو ہندو تہذیب ملیامیٹ ہو جائے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندو اور مسلمان ایسا سوچنے میں حق بجانب ہیں۔

ایک نمائندہ: تو گویا آپ پاکستان کے حق میں ہیں؟

حضور لیڈر: آپ پہلے میری بات تو سن لیجئے۔ بہت غور و خوض کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ واقعی اسلام اور ہندوازم دونوں خطرے میں ہیں۔

ایک نمائندہ: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

حضور لیڈر: میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ لیکن میرے خیال میں اس امر کے باوجود ہندوستان کو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کی ضرورت نہیں۔

ایک ہندو اخبار کا نمائندہ: تو گویا آپ اکھنڈ ہندوستان کے حق میں ہیں؟

حضور لیڈر: آپ مجھے پہلے بات تو ختم کر لینے دیجئے۔ ہاں تو میرے خیال میں ہندوستان کو ہندوستان ہی رہنے دیا جائے۔ پاکستان، خالصتان، اچھوتستان کی ضرورت نہیں۔

ایک نمائندہ: یہی تو مہاتما گاندھی کہتے ہیں۔

حضور لیڈر: مگر گاندھی جی کے فارمولے اور میرے فارمولے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

مہاتما گاندھی اس بات کا کوئی حل پیش نہ کر سکے کہ اگر اسلام خطرہ میں پڑ گیا تو اس کا کون ذمہ دار ہوگا۔

ایک ہندو اخبار کا نمائندہ: مگر کیا واقعی اسلام خطرہ میں پڑ سکتا ہے۔

حضور لیڈر: کیوں نہیں۔ آپ تاریخِ اسلام کا مطالعہ کیجئے۔ یقیناً آپ واقعات کو جھٹلا نہیں سکتے۔

ایک نمائندہ: اس طرح تو ہندوازم بھی کئی بار خطرہ میں پڑ چکا ہے۔

حضور لیڈر: میں کب کہتا ہوں کہ ہندوازم ہمیشہ محفوظ رہا ہے۔ میں نے تو شروع میں اس بات کی توضیح کر دی ہے کہ اسلام اور ہندوازم دونوں خطرے میں پڑنے کے امکانات ہیں۔ یہی تو میرے فارمولے میں خوبی ہے کہ وہ اس خطرے سے بچنے کا خاطر خواہ طریقہ پیش کرتا ہے۔

ایک نمائندہ: وہ طریقہ ہمیں بھی بتا دیجئے۔

حضور لیڈر: دیکھئے حضرات! مہذب ممالک میں حفظِ ماتقدم کے طور پر ہر چیز کو خطرہ سے بچانے کے لیے اس کا بیمہ کرایا جاتا ہے۔ انسانی زندگی، مکان کو آگ لگ جائے وغیرہ کا بیمہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔ امریکہ میں کئی ایکٹرسوں نے اپنی آواز، اپنی سڈول ٹانگوں، اپنے خوبصورت ناخنوں کا بیمہ کرایا ہے۔ امریکہ واقعی عجیب ملک ہے، حضرات وہاں ہر چیز کا بیمہ ہو سکتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ایک شخص نے اپنے طوطے کی چونچ کا بیمہ کرایا ہے۔

ایک نمائندہ: لیکن ہندو مسلم اتحاد کا اس بات سے کیا تعلق ہے؟

حضور لیڈر: ہندو مسلم اتحاد کا اس بات سے گہرا تعلق ہے۔ دیکھئے، اگر ہندو اور مسلمان ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کر سکتے تو انہیں چاہئے کہ وہ اپنے مفاد کا بیمہ کسی امریکن کمپنی سے کرا لیں۔ اس طرح وہ دونوں اس خطرہ سے بچ جائیں گے جو سانپ کے پھن کی طرح ہمیشہ ان کے سروں پر لہراتا رہتا ہے۔ اس کانفرنس میں آنے سے پہلے میں ''کلچرانشورنس'' کے ایجنٹ سے بات چیت کر رہا تھا۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ یہ کمپنی ہندو مسلم مفاد کا بیمہ کرنے کے لیے تیار ہے۔ سالانہ پریمیم بھی کوئی زیادہ نہیں۔ یعنی صرف پچاس ہزار ڈالر۔ میرے خیال میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے پاس اتنا روپیہ ہے کہ وہ پریمیم ادا کر سکیں گے۔ تو حضرات یہ ہے میرا نیا فارمولا۔ کیوں۔ کیا خیال ہے آپ کا اس کے متعلق؟

تمام نمائندے: (ایک زبان) واقعی لائق قدر فارمولا ہے۔ ہم حضور لیڈر کو مبارکباد پیش

کرتے ہیں۔حضور لیڈر زندہ باد۔

حضور لیڈر: حضرات! آپ نعرے مت لگائیے۔ سوراج نعرے لگانے سے نہیں ملے گا۔ سوراج اس فارمولے پر عمل کرنے سے ہی مل سکتا ہے۔ اس لیے آپ سب کا فرض ہے۔ کہ آپ پہلی فرصت میں اس فارمولے کی اشاعت کا بندوبست کریں۔ اس پر لیڈنگ آرٹیکل لکھیں۔ اس کی کاپیاں چھاپ کر لوگوں میں مفت تقسیم کریں۔ یہ ہے اصلی خدمت!

تمام نمائندے: حضور بجا فرماتے ہیں۔

حضور لیڈر: خدا آپ کو توفیق دے اور آپ صحیح معنوں میں قوم کے کام آسکیں۔ خدا حافظ۔

سیکرٹری: حضرات خیال رہے کہ حضور لیڈر کی تصویر صفحۂ اول پر ہو۔

☆☆☆

کہتے ہیں جس کو عشق.....

''ادھر اس نشست پر بیٹھئے پروفیسر صاحب یہاں سارا شہر بخوبی نظر آتا ہے۔ یہ لیجیے دوربین۔ اسے سامنے والے مکان کی چھت کی طرف گھمائیے۔ اوہ! آپ جھجکتے ہیں۔ لائیے مجھے دیجئے۔ ابھی آپ کو وہ جلوہ نظر آئے گا کہ اچھل پڑیں گے آپ، ذرا اپنی نگاہیں اسی چھت پر گاڑے رکھیے۔ بھئی اس چھت پر نہیں۔ اس پر وہ جو ہماری چھت سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلہ پر ہے۔ اے لو، وہ آ گئی۔ نہیں یہ تو خادمہ ہے، بری نہیں یہ بھی نیلما! کیا بات ہے نیلما کی! بوٹا سا قد، شفق سے ملتا جلتا رنگ، ستواں ناک۔ مسکراتی ہوئی آنکھیں! آپ تیار رہیے۔ عنقریب آپ کو اپنی آنکھوں کی خیرگی کا احساس ہوگا۔ وہ دیکھیے۔ ارے نہیں۔ یہ تو نیلما کا کتا ہے۔ مجھے اس کتے سے بھی محبت ہے۔ کیا خوب کہا ہے کسی نے ''مجھ سے محبت کرو میرے کتے سے محبت کرو'' کریں گے صاحب ضرور کریں گے۔

پائے سگ بوسید مجنوں..... دیکھیے دیکھیے وہ کوئی آیا۔ ذرا سامنے آ جان نیلما۔ ارے یہ تو نیلما کی ماں ہے۔ غضب ڈھاتی ہوگی جوانی میں۔ لیکن اب وہ پہلی سی بات کہاں۔ یہ بنگالی عورتیں بہت جلد بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ لو وہ تن کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ بھئی یہ شگون اچھے نہیں۔ نیلما کی بجائے..... نیلما کی ماں۔ خدا جانے محبوب کی ماں کے متعلق مجنوں کا کیا نظریہ تھا، ہمیں تو ایک

آنکھ نہیں بھاتی یہ بنگالن۔ اگر اب بھی نیلسا نہ آئی تو میں دیوانہ ہو جاؤں گا۔ آخر صبر کی بھی حد ہوتی ہے۔ اری، ارے، نیلسا تو گیراج کے باہر موٹر کے پاس کھڑی ہے۔ کسی کے ساتھ جا رہی ہے۔ شاید باپ کے ساتھ۔ بھئی یہ زیادتی ہے۔ ذرا دوربین سنبھالنا پروفیسر صاحب، میں اس چھت سے کود کر خودکشی کرنا چاہتا ہوں۔

شکریہ!''۔

''عجیب قصہ ہے یہ بھی۔ بعض اوقات مجھے خود تعجب ہونے لگتا ہے۔ آپ کبھی ٹنگمرگ گئے ہیں؟ نہیں گئے۔ خیر کوئی بات نہیں، پچھلے سال ٹنگمرگ کے سینے ٹوریم میں تھا۔ مجھے دق تھی۔ دق کا پہلا درجہ۔

ایک رات کا ذکر ہے۔ ڈیڑھ بجے کا عمل ہوگا۔ یک لخت میں زور سے کھانسا زنانہ وارڈ سے ایک لڑکی نے میری کھانسی کا جواب کھانسی سے دیا۔ چند ثانیوں کے بعد میں پھر کھانسا۔ اس کھانسی کا جواب پھر زنانہ وارڈ سے کھانسی ہی میں آیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ایک دوسرے کو دیکھے بغیر، ہمارے آنکھیں لڑ گئی ہیں۔ تم کہو گے کہ کھانسی ''لڑ گئی'' خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ رفتہ رفتہ وہ لڑکی میرے عشق میں گھلنے لگی۔ مردانہ اور زنانہ وارڈ کے درمیان ایک دیوار حائل تھی۔ اسے پھاندنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ سوچا کسی رات زنانہ وارڈ کے عقب میں جا کر ان دیکھی محبوبہ سے بات چیت کروں۔ اگست کی ایک سیاہ اور ابر آلود رات کو میں زنانہ وارڈ کے عقب میں گیا۔ اف کس قدر خوفناک رات تھی وہ۔ بادل کی کڑک بجلی کی کڑک، بجلی کی چمک اور جھاڑیوں میں پھنکارتے ہوئے زہریلے سانپ، جونہی میرا پاؤں ایک جھاڑی پر پڑا۔ دو تین سانپ پھنکاریں مار کر میری طرف لپکے۔ میں اچھل کر کھڑکی کے ساتھ جا لگا۔ بھئی ہنسو نہیں۔ خوف کے عالم میں ایسا ہی ہو جاتا ہے''۔

''آشا'' میں نے آہستہ سے کہا۔

کوئی جواب نہ آیا۔ ''آشا'' میں نے دہرایا۔ ''میں ہوں شیام۔ تمہارا عاشق صادق''۔

یک لخت وہ اٹھ کر اپنے بستر پر بیٹھ گئی۔ اس نے بے تحاشا کھانسنا شروع کر دیا۔

''آشا'' میں نے اونچی آواز سے کہا۔ ''آہستہ کھانسو۔ میری آواز تمہاری کھانسی میں گم ہو رہی ہے''۔

وہ برابر کھانسے جا رہی تھی۔

''آشا'' میں نے غصہ سے کہا۔ ''فرصت کے وقت کھانس لینا، رات بیتی جا رہی ہے''۔

اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دروازہ کی طرف دیکھا۔

''دروازے کی طرف نہیں کھڑکی کی طرف۔ میں آ گیا ہوں۔ خوامخواہ کھانس کر اپنے آپ کو پریشان نہ کرو''۔

اس نے دم لے کر پھر کھانسنا شروع کر دیا۔

''آشا''۔

''نرس'' آشا نے چلا کر کہا۔

ایک چینی کی گڑیا دوڑتی ہوئی اندر آئی اور آتے ہی اس نے آشا کے منہ میں تھرمامیٹر ٹھونس دیا۔

میں کھڑکی کے نیچے دبک کر بیٹھ گیا۔ معاً ایک سانپ میرے بوٹ پر سے رینگتا ہوا جھاڑی میں غائب ہو گیا۔

''چوکیدار'' نرس کہہ رہی تھی۔ ''ڈاکٹر ہیرپ کو بلاؤ۔ آشا ختم ہو رہی ہے''۔ میرے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا میں اپنے وارڈ کی طرف چل دیا۔

صبح پتا چلا کہ آشا اس دنیا میں نہیں رہی۔ ڈاکٹر ہیرپ کا اب تک یہی خیال ہے کہ آشا دق سے مری۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس بے چاری نے میرے عشق میں گھل گھل کر جان دی۔ دق! یہ ڈاکٹر لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں۔ کجا عشق کجا دق!

''پروفیسر صاحب، مجھے آپ سے گلہ ہے۔ آپ کبھی گھر پر نہیں ملتے، متواتر تین دن سے آپ سے ملنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ نہایت ضروری کام ہے۔ آپ مذاق سمجھیں گے۔ لیکن بھئی یہ موقع ہنسی مذاق کا نہیں۔ دستگیری کا ہے۔ اب آپ سے کیا پردہ۔ میں انگریزی میں ایک محبت نامہ لکھوانا چاہتا ہوں۔ کیتھرین کے نام۔ کون ہے کیتھرین' آپ سمجھے کوئی دوغلی لڑکی نہیں۔ بھئی یہ کوئی معمولی لڑکی نہیں۔ یہ ہے وہ عدیم المثال حسینہ جسے نیویارک والوں نے سن چوالیس کی ملکۂ حسن کا خطاب دیا ہے۔ یہ دیکھئے اس کی فوٹو۔ کیا پنڈلیاں ہیں ظالم کی! گداز جسم، دلفریب تبسم اور کولھے، کولھے تو آپ نے دیکھے ہی نہیں۔ بھئی اب آپ چاہے کچھ کہیں۔ مجھے تو اس لڑکی سے

عشق سا ہو گیا ہے۔ آپ مجھے ایک نہایت پر تکلف دعوت نامہ لکھ دیجئے۔ لکھنے کو تو ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بھی لکھ لیتا ہوں۔ لیکن جائے استاد..... نہایت مرصع اور مقفی نثر ہو۔ ایسی نثر جس پر شعریت کا گمان ہو سکے نپولین یا بائرن کا اسلوب بیان۔ بس پھڑک اٹھے اسے پڑھ کر، کیا کرے گی نیویارک میں۔ نیویارک میں اسے مجھ جیسا عاشق تو ملنے سے رہا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ ہالی وڈ کے تاجر اسے اونے پونے خرید لیں گے۔ ساری عمر نگار خانوں میں پڑی سڑے گی۔ تین چار سال میں دس بارہ طلاق حاصل کر لے گی۔ بھئی ہندوستانی عشاق کی وفا شعاری تو ضرب المثل ہے۔ یہاں تو ہم لوگ سیم تنوں کے پاؤں دھو دھو کر پیتے ہیں۔ اچھا تو کب تک لکھیں گے۔ یہ محبت نامہ آپ؟ آپ پوچھتے ہیں مجھے عشق ہوا کیسے۔ آپ کو ابھی یقین نہیں آیا! پروفیسر صاحب، آپ نے ہونے کی بھی ایک ہی کہی۔ سنا نہیں وہ آپ نے میرزا غالب کا مصرع

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب

☆☆☆

خارستان

ایک سیاح نے جو حال ہی میں جزیرۂ خارستان سے لوٹا ہے، اس جزیرہ کے متعلق چند انکشافات کیے ہیں جو سند باد جہازی کے سفر ناموں سے زیادہ سنسنی خیز اور الف لیلیٰ کے قصوں سے زیادہ ہوشربا ہیں۔ یہ سیاح لکھتا ہے۔ ''جزیرۂ خارستان'' ہندوستان کے ساحل سے پندرہ سو میل کے فاصلہ پر بحر ہند میں ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ اس جزیرہ میں صرف دو قومیں بستی ہیں۔ ''ہنگم'' اور ''بے ہنگم'' یہ دونوں قومیں پچھلے ایک ہزار برس سے اس لیے آپس میں برسر پیکار ہیں کہ ہنگم قوم کے افراد اپنے دیوتاؤں کی خوشامد کرتے وقت شمال کی طرف منہ کرتے ہیں اور بے ہنگم جنوب کی طرف۔ نیز ہنگموں کو بینگن کا بھرتا پسند ہے اور بے ہنگموں کو آلو کا۔ خارستان میں کوئی بے ہنگم اپنی ہتھیلی پر آلو رکھ کر اس بازار یا محلّہ میں نہیں گزر سکتا جس میں ہنگم رہتے ہیں۔ چند سال ہوئے اس جزیرہ میں بڑا زبردست ہنگم بے ہنگم فساد ہوا جس میں تین ہزار ہنگم مارے گئے اور تقریباً اتنے ہی بے ہنگموں نے جامِ شہادت چکھا۔ وجہ یہ بیان کی جاتی ہے

کہ ایک ہنگم نے ایک عدمینگن ایک بے ہنگم کے سر پر دے مارا تھا۔ جس وقت کوئی نووارد خارستان کی سرزمین پر قدم رکھتا ہے تو اس کو اہل ہنگم یوں مخاطب کرتے ہیں۔ ''اگر آپ نہ ہنگم ہیں اور نہ بے ہنگم تو آپ کی عزت کرتے ہیں۔ اگر آپ بے ہنگم ہیں تو ہم آپ سے لڑنے کے لیے تیار ہیں۔ اگر آپ ہنگم ہیں تو ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ فوراً بے ہنگموں کے خلاف اعلان جنگ کیجئے''۔

خارستان میں پچاس فی صدی لوگ نیم پاگل ہیں لیکن خارستان میں ایک بھی پاگل خانہ نہیں۔ یہ لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ مثلاً ایک نیم پاگل کہتا ہے۔ ''بٹیر متبرک پرندہ ہے، اس کا گوشت نہیں کھانا چاہئے''۔ دوسرا جواب دیتا ہے ''بٹیر کا گوشت بہت لذیذ ہوتا ہے، میں ضرور کھاؤں گا''۔ چند منٹ آپس میں اس مسئلہ پر تکرار کرنے کے بعد پہلا نیم پاگل دوسرے کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ یہ نیم پاگل ایک دوسرے کے گھروں کو (اور کبھی کبھی اپنے گھروں کو) آگ لگا کر تالیاں پیٹنے لگتے ہیں۔

خارستان میں سب سے عجیب الخلقت انسان، راہ نما ہیں۔ یہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ راہ نما جن کی کھوپڑیوں میں دماغ سرے سے غائب ہے اور راہ نما جن کی کھوپڑیوں میں دماغ تو ہے لیکن اس کی ساری چولیں ڈھیلی ہیں۔ ہر دو قسم کے رہنماؤں کا شغل ''آدم بازی'' ہے۔ بٹیروں اور مرغوں کی بجائے یہ لوگ آدمی پالتے ہیں اور ان کو آپس میں لڑا کر اپنی لیے تفریح کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ راہ نما بننے کے لیے خارستان میں زیادہ دماغ سوزی کی ضرورت نہیں۔ جزیرہ کے وسط میں ایک عمارت ''لال کوٹھڑی'' ہے جو شخص اس عمارت کی سیر کو آتا ہے۔ راہ نما قرار دیا جاتا ہے چاہے، وہ لال کوٹھڑی میں جانے سے پہلے کوچوان یا عطار کیوں نہ ہو۔

خارستان کے کھیتوں میں گندم یا دھان کی بجائے سونا، چاندی اور جواہرات اگتے ہیں۔ لیکن خارستانی کسانوں کی طبیعت کی افتاد کچھ ایسی ہے کہ وہ ساری کی ساری فصل ہمسایہ جزیروں کو بھیج دیتے ہیں، اور اس اقدام کے جواز میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اگر ہم ان جزیروں کی سرپرستی نہ کریں تو یہ جزیرے بالکل کنگال ہو جائیں۔ خارستان میں زراعتی مشینوں کا استعمال قانوناً ممنوع ہے۔ جو شخص ان مشینوں کے فوائد گنوائے، اسے فوراً سنگسار کیا جاتا ہے۔ روایت

ہے کہ ایک نو وارد ایک دفعہ غلطی سے خارستان میں ایک زراعتی مشین لے آیا۔ اسے اس مشین کے ساتھ باندھ کر سمندر میں پھینکوا دیا گیا۔

خارستان میں عورتوں کی حالت قابلِ رشک ہے۔ بالخصوص بیویوں کی۔ بیشتر خاوند اپنی بیویوں کی عصمت کی پاسبانی اس شدت سے کرتے ہیں کہ انہیں لوہے کے بڑے صندوقوں میں بند کر دیتے ہیں، جہاں وہ ساری عمر چشمِ بد سے محفوظ رہتی ہیں۔ اس جزیرہ میں بہت سی عورتیں گوشت پوست کی بجائے موم کی بنی ہوئی ہیں۔ ان پر غیر مرد کی نگاہ پڑ جائے تو فوراً پگھل جاتی ہیں۔ خارستانی عورتوں کے منہ میں زبان نہیں ہوتی۔ اس سیاح نے چند عورتوں سے بات چیت کرنے کی کوشش کی مگر اسے پتا چلا کہ سب گونگی ہیں۔

خارستان میں سب سے نفع بخش تجارت توہمات کی ہے۔ غالباً اس لیے کہ اس کے لیے سرمایہ کی ضرورت نہیں۔ جو اشخاص توہمات کا بیوپار کرتے ہیں، انہیں شعبدہ باز کہا جاتا ہے۔ کاروبار شروع کرنے سے پہلے وہ ایک آدھ شعبدہ دکھاتے ہیں۔ مثلاً کسی چوراہے پر سرکے بل کھڑے ہو جاتے ہیں، کسی اونچے درخت سے سمندر میں چھلانگ لگا دیتے ہیں، کسی اڑتے پرندے کو خلیل کا نشانہ بناتے ہیں۔ شعبدہ بازوں کی دکانیں قابلِ دید ہیں۔ کسی نے اپنی دکان میں ایک ''مردہ'' رکھا ہوا ہے، کسی نے کوئی وزنی کتاب یا پتھر۔ کسی نے ایسی تصویر جسے دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ ان دکانوں پر صبح و شام ہُن برستا ہے۔ خریداروں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ کوئی مردے کو سلام کر رہا ہے، کوئی کتاب کے چکر کاٹ رہا ہے، کوئی تصویر کے سامنے گڑگڑا رہا ہے۔

سیاسی لحاظ سے خارستان میں دو جماعتیں ہیں۔ قصاب اور دیبل۔ قصابوں کا پیشہ ذبح کرنا اور دیبلوں کا ذبح ہونا۔ دیبل ضرورت سے زیادہ سادہ لوح اور شریف واقع ہوئے ہیں۔ ان کی شرافت کا یہ عالم ہے کہ اگر ان کی پیٹھ پر کوڑے بھی برسائے جائیں تو ناراض نہیں ہوتے۔ عموماً دیبل اپنے لیے پیدا ہوتے ہیں لیکن مرتے قصابوں کے لیے ہیں۔ ہر قصاب کے گھر دو تالاب ہوتے ہیں۔ ایک خون کا دوسرا شراب کا۔ خون کے تالاب میں دیبل لوگوں کی نعشیں تیرتی رہتی ہیں اور شراب کے تالاب میں طوائفوں اور رقاصاؤں کی۔ قصاب لوگ تعداد میں اتنے تھوڑے اور دیبل اتنے زیادہ ہیں کہ تعجب ہوتا ہے، وہ قصابوں سے نجات کیوں نہیں حاصل کر لیتے۔ سیاح

کے خیال میں اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ دبیلوں کو ذبح ہونے میں لطف آتا ہے۔

خارستان کی خاص چیز یہاں کا نیلام گھر ہے جہاں ہر اتوار کو روحیں نیلام کی جاتی ہیں۔ نیلام گھر کا مالک ''روح فروش'' کو حاضرین کے سامنے پیش کرنے کے بعد با آواز بلند کہتا ہے ''فلاں ابن فلاں اپنی روح بیچنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے بولی دیجئے''۔ بولی عموماً ڈیڑھ آنے سے شروع ہوتی ہے اور ڈیڑھ سو روپیہ تک جاتی ہے۔ خارستان میں روحوں کی قیمت کچھ اتنی زیادہ نہیں۔ یہ سیاح لکھتا ہے کہ اس نے ایک دفعہ راہ نما کی روح صرف سات آنے میں خریدی۔

خارستان میں کئی متبرک مقامات ہیں جہاں پاکیزگی کے سوا سب کچھ ہے۔ کئی تعلیمی درسگاہیں ہیں۔ جہاں صرف، ''جہالت'' کی تعلیم دی جاتی ہے۔ کئی باغیچے ہیں جن میں کانٹوں کے سوا کچھ نہیں اگتا۔ خارستانی راہ نماؤں کا خیال ہے کہ جب تک خارستان میں کافی تعداد میں عبادت گاہیں نہیں بنیں گی، خارستان کا شیرازہ پریشان رہے گا۔ جہاں تک اس سیاح کی رائے کا تعلق ہے۔ اس کی دانست میں تاوقتیکہ خارستان میں بڑے بھاری پیمانے پر پاگل خانے تعمیر نہیں کیے جائیں گے، خارستان، خارستان ہی رہے گا۔

☆☆☆

پھر لکھئے

بچپن میں سنا تھا کہ اگر آپ خوش نویس بننا چاہتے ہیں تو اس کا صرف ایک طریقہ ہے۔ یعنی لکھئے اور پھر لکھئے۔ اس وقت یہ سان گمان بھی نہ تھا کہ کامیاب مکالمہ نویس بننے کا بھی یہی گر ہے۔ چنانچہ اگر آپ میں صبر و تحمل کا مادہ نہیں، تو آپ چاہے اور کچھ لکھ سکیں، فلمی مکالمے نہیں لکھ سکتے۔ فلمی مکالمہ نویسی کا پہلا اصول ہے کہ ڈائریکٹر صاحب کی ذہنی سطح کا خیال رکھا جائے۔ ممکن ہے آپ بہت اچھے مکالمے لکھتے ہوں لیکن اگر ڈائریکٹر صاحب انہیں نہیں سمجھ سکتے تو لکھنے کا فائدہ؟

اس لیے قلم اٹھانے سے پہلے ڈائریکٹر صاحب سے پوچھ لیجئے۔ کیوں صاحب آپ فلاں لفظ کے معنی جانتے ہیں یا آپ نے فلاں محاورہ سنا ہے۔ اگر وہ اثبات میں سر ہلا دیں تو بے شک انہیں استعمال کر لیجئے ورنہ اس لفظ یا محاورے کو نظر انداز کر دیجئے۔ اگر آپ ایسا نہیں کریں گے، تو

ڈائریکٹر صاحب کا مزاج برہم ہو جائے گا۔ آپ لاکھ کہئے گا کہ یہ لفظ ٹھیک ہے۔ یہ محاورہ صحیح ہے۔ وہ اس بات کی رٹ لگائے جائیں۔ ہم نے نہیں سنا اور چونکہ ڈائریکٹر لوگوں نے بہت کم الفاظ یا محاورے سنے ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی معذوری کا خیال رکھیئے، بعض اوقات ڈائریکٹر صاحب کسی مستند محاورہ میں ترمیم فرمانا چاہیں تو انہیں ایسا کرنے کی اجازت دیجئے۔ ورنہ آپ کی ملازمت خطرہ میں پڑ جائے گی۔

مثلاً آپ نے لکھا ہے۔ ''بھیا میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلیں''۔ اور ڈائریکٹر صاحب فرماتے ہیں۔ ''کچی گولیاں کھیلتا نہیں کھانا ہوتا ہے''۔ تو اس حالت میں آپ کو واجب ہے کہ آپ فوراً ڈائریکٹر صاحب پر ایمان لے آئیں اور نہایت انکساری کے ساتھ کہیں۔ ''معاف کیجئے غلطی میں کھائیں کی بجائے کھیلیں لکھا گیا''۔ اسی طرح یاد رکھیے کہ فلمی مکالموں میں وہ زبان استعمال کی جاتی ہے جسے عرفِ عام میں آدھا تیتر آدھ بٹیر کہا جاتا ہے۔ یعنی چالیس فی صد اردو اور ساٹھ فی صد ہندی۔ اس لیے آپ ہر فقرہ میں اس تناسب کو مدنظر رکھیے۔

مثال کے طور پر ایسا مت لکھئے۔ ''معاف کیجئے میری طبیعت ناساز ہے''۔ بلکہ شما کیجئے میری طبیعت میں تھوڑی سی گڑبڑ ہے''۔ بعض ڈائریکٹروں کو چند الفاظ سے خاص انس ہوتا ہے۔ وہ الفاظ بار بار مکالموں میں دہرائیے، مثلاً اگر ڈائریکٹر صاحب کو لفظ ''چغد'' پسند ہے تو کسی کردار کے منہ سے یہ فقرہ ضرور کہلوائیے۔ ''اماں ہم چغد۔ ہماری قسمت چغد۔ بیوی چغد۔ بچے چغد۔ نوکر چغد۔ اور تو اور ہمارے گھر کے کتے چغد۔ بلیاں اور چوہے چغد''۔

مکالمہ نویسی خاصا دلچسپ شغل ہے بشرطیکہ اسے پیشہ بنایا جائے۔ کہنے کو تو ایک فلم کا مکالمہ بیس پچیس صفحوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ لیکن اگر تمام صفحوں کو اکٹھا کیا جائے جو آپ نے لکھے اور ڈائریکٹر صاحب نے ناپسند فرمائے تو اتنی بڑی کتاب تیار ہو سکتی ہے جو کم از کم ضخامت میں ہومر کی آڈیسی یا المیکی کی رامائن کا مقابلہ کر سکے۔ اگر یقین نہ آئے تو کسی دن غریب خانہ پر تشریف لائیے اور اس پلندہ کو ملاحظہ فرمائیے جو دو ہزار صفحوں پر مشتمل ہے۔ یہ صرف ایک فلم کے مکالمے ہیں۔ یہ میں نے کیوں اور کیسے لکھے۔ یہ بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے۔

ایک دفعہ مجھے بمبئی جانے کا اتفاق ہوا۔ چند دن ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں خوب محفلیں گرم ہوئیں۔ اس کے بعد یک لخت پیسے ختم ہو گئے۔ ایک دن سمندر کے کنارے کھڑا سوچ رہا تھا کہ آیا

خودکشی کی جائے یا کسی سے قرض لیا جائے کہ اتنے میں ایک دوست سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان کے سامنے جو اپنی تنگدستی کا رونا رویا تو فرمانے لگے کچھ کام کیوں نہیں کر لیتے''؟ میں نے پوچھا۔ ''کیسا کام''۔ ''یہی مکالمے وکالمے لکھنے کا''۔ میں نے عاجزی سے کہا۔ ''بمبئی میں ہمیں کون پوچھتا ہے''۔ انہوں نے جلدی سے جواب دیا۔ ''ایسا مت کہئے۔ بمبئی فلموں کی فیکٹری ہے۔ یہاں ہر تیسرا آدمی پروڈیوسر، ہر چوتھا آدمی ڈائریکٹر، ہر پانچواں آدمی ڈسٹری بیوٹر ہے۔ میری دو تین ڈائریکٹروں سے جان پہچان ہے۔ کہو تو ان سے بات کروں''۔ دوسرے دن وہ مجھے ایک ڈائریکٹر کے پاس لے گئے۔ ان کا نام میں اس لیے نہیں لینا چاہتا کہ کافی گمنام آدمی ہیں۔ پہلے کسی تھیٹر میں پردے اٹھانے پر ملازم تھے۔ پھر سٹیج پر مسخرے کا پارٹ ادا کرتے رہے۔ بعد میں کسی سٹوڈیو میں ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ وہاں سے ترقی کرتے کرتے ڈائریکٹر کے عہدہ تک پہنچ گئے۔ میرے دوست نے میرا تعارف کرایا۔ ڈائریکٹر صاحب نے ایک نگاہ غلط انداز مجھ پر ڈالی اور پوچھا۔ ''یہ آپ کے ہاتھ میں کون سی کتابیں ہیں''۔

میں نے کہا۔ ''ارسطو'' اور ''شیکسپیئر''۔

فرمانے لگے۔ ''برا نہ مانئے گا۔ اگر آپ فلمی مکالمے لکھنا چاہتے ہیں تو ارسطو شیکسپیئر کو خیر باد کہنا ہوگا''۔

اس کے بعد انہوں نے میری تعلیم، فلمی لائن میں تجربہ، میری تصنیفات کے متعلق چند باتیں پوچھیں اور سرپرستانہ انداز میں کہا۔ ''دیکھیے آپ اس لائن میں مبتدی ہیں، اس لیے معاوضہ کا خیال نہ کیجئے گا۔ اگر آپ کے مکالمے کامیاب ہوئے تو نہ صرف آپ کا نام ہوگا، بلکہ منہ مانگے دام بھی ملیں گے۔ فی الحال آپ سو روپے قبول کر لیجئے''۔

میں نے جرأت کر کے کہا۔ ''بہت قلیل رقم ہے''۔ ڈائریکٹر صاحب نے تیوری چڑھا کر کہا۔ ''قلیل! آپ کو پتا ہے زلفی صاحب آج کل مکالمے لکھنے کا پندرہ ہزار سے کم نہیں لیتے۔ پہلی بار کیا ملا تھا۔ پچیس روپے اور دیسی شراب کی ایک بوتل۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ انہوں نے سنٹ پکچر کے مکالمے لکھے تھے اور ہم آپ سے سوشل پکچر کے مکالمے لکھوا رہے ہیں جس میں چوٹی کے ستارے کام کریں گے۔ مس آفتاب، جس کو ہم نے ایک لاکھ روپیہ انکم ٹیکس سے مبرا ادا کیا ہے۔ اور مسٹر شرقی کمار جنہوں نے اسی ہزار روپیہ لیا ہے اور جو صرف ایک مہینا کام کریں

گئے''۔ کیونکہ مجھے روپے کی سخت ضرورت تھی، اس لیے میں نے ان کی پیش کش منظور کر لی۔ انہوں نے مجھے سٹوڈیو میں دس بجے آنے کو کہا۔ اگلے دن وقت مقررہ پر سٹوڈیو پہنچ گیا۔ سب سے پہلے انہوں نے کہانی سنائی جو انہوں نے خود لکھی تھی۔ نام تھا۔ ''ڈنگرا کی چھوری'' میں نے سمجھا کہ ڈنگرا کسی شخص کا نام ہے۔ لیکن کہانی سننے کے بعد معلوم ہوا کہ ڈنگرا ایک گاؤں کا نام ہے جہاں کے ڈائریکٹر صاحب رہنے والے ہیں۔ کہانی مختصراً یہ تھی۔ ''ایک لڑکا کالج سے بھاگ کر ایک گاؤں میں جاتا ہے اور ایک باغ میں ناریل کے درخت پر چڑھ کر گانا گانے لگتا ہے۔ ادھر سے ایک ملاح کی لڑکی آتی ہے اور اسے پتھر کا نشانہ بنا کر زخمی کر دیتی ہے۔ لڑکا درخت سے نیچے گر پڑتا ہے، لڑکی اسے اٹھا کر لے جاتی ہے۔ تیمارداری کے دوران میں اسے لڑکے سے عشق ہو جاتا ہے۔ ایک رات وہ گھر سے بھاگ نکلتے ہیں۔ لڑکی کا باپ غم میں گھل گھل کر مر جاتا ہے۔ لڑکا ایک تھیٹر میں ملازمت کر لیتا ہے، جہاں اسے ایک رقاصہ سے محبت ہو جاتی ہے۔ ایک دن رقاصہ اور وہ لڑکا تھیٹر سے بھاگ نکلتے ہیں اور کسی شہر میں جاتے ہیں۔ وہاں رقاصہ کو ایک نواب سے عشق ہو جاتا ہے اور وہ اس کے ساتھ شادی کر لیتی ہے۔ لڑکا مایوس ہو کر خودکشی کرنے کی غرض سے دریا میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔ عین اس موقعہ پر ملاح کی لڑکی کشتی لے کر سامنے سے نمودار ہوتی ہے اور اس کی جان بچاتی ہے۔ اس کے بعد دونوں کی شادی ہو جاتی ہے''۔

کہانی سنانے کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ کیسی ہے۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ''عجیب سی ہے''۔ انہوں نے چیں بہ چیں ہو کر کہا۔ ''کیا مطلب ارے۔ میاں یوں کیوں نہیں کہتے کہ تہلکہ مچ جائے گا۔ ''تہلکہ'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''تہلکہ'' انہوں نے دہرایا۔ ''ہاں ہاں تہلکہ۔ دیکھو اس کہانی میں آٹھ کلائمکس ہیں۔ بارہ گانے ہوں گے۔ تین ناچ اور پانچ سٹار۔ تہلکہ کیسے نہیں مچے گا''۔ اس کہانی کو انہوں نے ایک سو پچیس چھوٹے بڑے مناظر میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ چنانچہ مجھے چند عملی ہدایتیں دیکر کہا کہ مکالمے لکھنا شروع کر دیجئے''۔ پہلا سین کالج کا کمرا تھا جس میں پروفیسر لڑکوں سے سوال کرتا ہے وہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ میں نے اس سین کے مکالمے بہت احتیاط سے لکھے اور کوشش کی کہ نوک جھونک شائستہ اور برجستہ ہو۔

دوسرے دن ڈائریکٹر صاحب کو وہ سین دکھایا۔ انہوں نے سرسری نظر سے اسے دیکھا اور فرمانے لگے۔ ''بات نہیں بنی۔ اسے پھر لکھئے'' حسب ارشاد اسے دوبارہ لکھا۔ ''کہنے لگے یہ تو

پہلے سے بھی بدتر ہے ایک بار پھر لکھئے، پھر لکھا ارشاد ہوا۔ ''اس میں صرف ایک فقرہ کام کا ہے۔ ایک بار پھر کوشش کیجئے''۔ ایک بار پھر کوشش کی کہنے لگے۔ ''مزہ نہیں آیا'' میں نے ذرا چڑ کر کہا۔ ''تو آپ فرما دیجئے کہ کیسے لکھوں''۔ ہاتھ کو گھما کر کہنے لگے: ''میرا مطلب ہے اسے یوں لکھا جائے کہ یوں ہوتا ہوا یوں ہو جائے''۔ میں نے کہا ''بہتر''۔ چنانچہ جی کڑا کر کے ایک بار پھر لکھا۔ پڑھنے کے بعد فیصلہ دیا کہ نہیں چلے گا۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ کس قسم کا سین چاہتے ہیں''۔ کہنے لگے ''جسے دیکھ کر لوگ ہنستے ہنستے لوٹن کبوتر بن جائیں'' اور یہ کہہ کر مسکرانے لگے۔ میں نے کہا ''آپ مسکرا کیوں رہے ہیں''۔ جواب دیا ''ایک خیال سوجھا ہے''۔ ''دیکھئے آپ ایسا کیجئے کہ ایک شاگرد اپنے ساتھ کلاس روم میں ایک پلا لے آئے۔ پروفیسر صاحب اس سے پوچھیں۔ ''ارے یہ کیا''۔ وہ لڑکا کہے۔ ''آپ کا نیا شاگرد''۔ پروفیسر کہے۔ ''اور آپ کا نیا ہم جماعت''۔ اس کے بعد پلا بھونکے اور ایک لڑکا کہے۔ ''پروفیسر صاحب۔ یہ تو بالکل آپ کی طرح انگریزی بولتا ہے''۔ اور پروفیسر کہے۔ ''کم از کم آپ سے بہتر انگریزی بولتا ہے''۔ ہاہاہا۔ ''کیوں کیسا رہا۔ میں کہتا ہوں۔ اگر آپ یہ سین لکھ گئے تو آپ آغا لفی کو مات دیں گے''۔

چنانچہ چھٹی بار یہ سین ان کی ہدایات کے مطابق لکھا اور پسند کیا گیا۔ دوسرا سین تھا، دریا کا کنارا۔ اس سین میں ملاح کی لڑکی مچھلیاں پکڑ رہی تھی اور چند نوجوان اس پر آوازے کس رہے ہیں۔ یہ سین آٹھ بار لکھا گیا اور ہر بار ہی ناپسند کیا گیا۔ آخر ڈائریکٹر صاحب کو پھر ایک خیال سوجھا اور کہنے لگے۔ دیکھو بھئی یہ سین یوں لکھو:

پہلا نوجوان: مچھلی تو اچھی ہے مگر جال میں پھنستی نظر نہیں آتی۔

دوسرا نوجوان: بچ کر کہاں جائے گی۔ ہم بھی معمولی ماہی گیر نہیں۔

تیسرا نوجوان: لو اب پھنسی کہ پھنسی۔

(لڑکی ان کی طرف کنکھیوں سے دیکھتی ہے)

چوتھا نوجوان: دیکھ بھئی پہلے ہی حصے بخرے کر لو۔ آنکھیں میں لوں گا۔

پہلا نوجوان: اور منہ میں۔

دوسرا: اور دھڑ میں۔

تیسرا: اور میں کیا لوں گا؟

پہلا: تم؟ بھئی تم مچھلی کی دم۔

(قہقہہ۔لڑکی ڈر کر دریا میں گر پڑتی ہے۔قہقہہ)

اتنا کہہ کر فرمانے لگے۔آخری فقرہ اس سین کی جان ہے۔''تم مچھلی کی دم''۔دیکھئے کیا ذو معنی فقرہ ہے۔''تم مچھلی کی دم''۔

اس کے بعد ناریل کے درخت کا سین تھا۔لڑکا ناریل توڑ رہا ہے اور ملاحن لڑکی اسے دیکھ رہی ہے۔پہلے وہ ایک دوسرے کے ساتھ سخت کلامی سے پیش آتے ہیں۔اس کے بعد لڑکی پتھر اٹھا کر اسے مارتی ہے۔ڈائریکٹر صاحب کا اصرار تھا کہ اس سین میں زیادہ سے زیادہ گالیاں استعمال کی جائیں۔کیوں کہ پبلک گالیوں پر خوب ہنسے گی اور مروجہ گالیوں کے علاوہ چند نئی گالیاں ایجاد کی جائیں۔چنانچہ ایک دن چائے پینے کے بعد ہم دونوں نئی گالیوں کی اختراع کرنے لگے۔

میں نے کہا''چنڈول کا بچہ''۔

کہنے لگے۔''نہیں چلے گا''۔

''مستول کا بچہ''۔

''نہیں چلے گا''۔

''ابوالہول کا بچہ''۔

''نہیں چلے گا''۔

''پستول کا بچہ''۔

کرسی سے اچھل کر کہنے لگے۔''چل جائے گا''۔

میں نے دبی زبان سے کہا۔''لیکن ہے کچھ عجیب سی گالی''۔

فرمانے لگے۔''میاں یہ فلمی دنیا ہے۔یہاں سب کچھ چلتا ہے۔پستول کا بچہ بہت اچھا ہے۔اسے ضرور رکھیے''۔

ایک دن خلافِ معمول ڈائریکٹر صاحب کو ایک مکالمہ بہت پسند آیا۔بہت تعریف کی۔چٹخارے لے لے کر پڑھا۔تین چار مرتبہ پڑھنے کے بعد کہنے لگے۔''لیکن بھئی اس میں تھوڑا سا ردوبدل کرنا پڑے گا۔دیکھئے جہاں آپ نے لکھا ہے۔''زندگی بے رنگ و بو ہے۔وہاں کر دیجئے

زندگی میں رنگ نہیں بو ہی بو ہے"۔ اور جہاں آپ نے لکھا ہے "نراشا کے اندھیارے میں آشا کی کرن چمک اٹھی۔" وہاں کر دیجئے "اماوس کے اندھیارے میں پورنماشی کا چاند چمکنے لگا"۔ اور "میں غریب ہوں جاہل نہیں" کی بجائے یہ لکھئے۔ "اگر میں غریب ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں بالکل گدھا ہوں"۔

میں آداب بجالایا اور بے اختیار کہہ اٹھا۔ "جائے استاد خالیست"۔

اب مجھے دو تین محبت کے سین لکھنے تھے۔ ڈائریکٹر صاحب چاہتے تھے کہ یہ سین ذرا زور دار ہوں۔ اس لیے انہوں نے مشورہ دیا کہ میں چند فقرے "رومیو اور جولیٹ" سے لے کر اس سین میں شامل کر دوں۔

رومیو کا انہیں یہ فقرہ بہت پسند آیا۔ "کاش دستانہ ہوتا تا کہ تیرے رخسار کو چھو سکتا"۔ کہنے لگے۔ "بالکل نئی چیز ہے"۔ میں نے کہا۔ لیکن ہماری کہانی کا ہیرو تو موسم گرما میں محبت کر رہا ہے۔ "دستانے کا کیا مطلب"۔ فرمانے لگے۔ "تو دستانے کی بجائے انگوٹھی کر دیجئے"۔

ایک شام کو ڈائریکٹر صاحب نے ایک انگریزی فلم دیکھی۔ دوسرے دن مجھے بلایا اور کہا۔ "دیکھو بھئی میں نے کل ایک انگریزی فلم دیکھی ہے۔ اس کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ ایک لڑکی سکول سے بھاگ کر ایک گھنے جنگل میں جا چھپی ہے۔ وہاں ایک شکاری آتا ہے جسے اس پر ہرنی کا دھوکا ہوتا ہے۔ وہ اسے بندوق کا نشانہ بناتا ہے۔ لڑکی زخمی ہو جاتی ہے اور شکاری اسے گھوڑی پر بٹھا کر گھر لے جاتا ہے..... اسے لڑکی سے محبت ہو جاتی ہے۔ میرا خیال ہے ہم بھی اپنی فلم کا آغاز اسی طرح کریں۔

اس لیے آپ آغاز کے دس بارہ سین پھر لکھیے"۔

میں نے پوچھا۔ "مگر اس واقعہ کے بعد ہیرو اور ہیروئن کیا کرتے ہیں"۔

سر کھجلا کر کہنے لگے۔ "یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔ آپ بھی سوچئے"۔

"اس انگریزی فلم میں کیا دکھایا گیا ہے"۔

"خوب یاد دلایا۔ بھئی وہاں تو وہ دونوں ایک سرکس میں ملازم ہو جاتے ہیں"۔

"تو ہم بھی انہیں سرکس میں بھیج دیں"۔

"سرکس ٹھیک نہیں رہے گا۔ کاپی رائٹ کا بھی تو خیال رکھنا ہے۔ ہم انہیں تھیٹر میں ہی

بھیجیں گے۔ جیسا کہ ہماری کہانی میں ہے''۔

ان کی فرمائش کے مطابق آغاز کے سین پھر لکھے۔

اس اثنا میں فلم کی شوٹنگ شروع ہوگئی اور اب ہر روز ڈائریکٹر صاحب ان مکالموں سے مایوس ہونے لگے جنہیں انہوں نے کئی بار لکھوانے کے بعد پسند کیا تھا۔ ایک دن گھبراہٹ اور سراسیمگی کی حالت میں میرے کمرے میں داخل ہوئے اور کہنے لگے۔ ''بھئی وہ جوتم نے ایک جگہ گلہری کا لفظ استعمال کیا ہے، وہ ہیروئن کی زبان پر نہیں چڑھتا۔ میں اسے کہتا ہوں کہو گلہری وہ کہتی ہے گل ہری۔ اس لیے کچھ آسان لفظ بتایئے''۔ میں نے کہا۔ ''گلہری کے لیے تو گلہری سے زیادہ آسان لفظ کوئی نہیں۔ آپ گلہری کی بجائے کوئی دوسرا جانور رکھ لیجئے''۔ پوچھنے لگے۔ ''مینڈک ٹھیک رہے گا''۔ آدھ گھنٹہ کے بعد پھر مجھے سٹوڈیو میں بلا بھیجا۔ سر پیٹ کر فرمانے لگے۔ ''عجیب مصیبت ہے اس بنگالی ایکسٹرا لڑکی کی زبان پر۔ ''بانسری'' کا لفظ نہیں چڑھتا۔ میں کہتا ہوں بانسری۔ وہ ہاں چھری یا کھرپی کی رٹ لگائی جاتی ہے۔ اب بانسری کے لیے کوئی اور لفظ بتایئے''۔ میں نے کہا۔ ''سارنگی''۔

ڈائریکٹر صاحب نے لڑکی سے کہا۔ کہو سارنگی اس نے ہونٹوں کو گول بناتے ہوئے۔

''چھارنگی''

''چھارنگی نہیں۔ سارنگی''۔

''ہاں ہاں چھارنگی۔ چھارنگی''۔

ڈائریکٹر صاحب نے چلا کر کہا۔ ''سارنگی'' لڑکی نے چلا کر کہا۔ ''چھارنگی'' ڈائریکٹر صاحب نے دوبارہ سر پیٹتے ہوئے مجھ سے کہا۔ کوئی ایسا ساز بتایئے جس میں ''س'' کا حرف نہ ہو''۔ میں نے ازراہ مذاق کہا۔ طنبورا''۔

بمبئی سے رخصت ہونے سے تین چار دن پہلے ڈائریکٹر صاحب فرمانے لگے۔ کہانی کا آغاز تو شاندار ہوگیا لیکن انجام کے متعلق مجھے شک ہے۔ میرے خیال میں اگر ہیرو، رقاصہ سے مایوس ہو کر فقیر بن جائے اور اس کی پہلی محبوبہ فقیرنی اور وہ دونوں گاتے گاتے کسی گلی کی نکڑ پر ملیں تو انجام بہتر ہو جائے گا''۔

''آپ کا کیا خیال ہے''۔ میں نے کہا۔ ''ان معاملوں میں آپ کا فیصلہ قطعی ہوتا ہے۔ اس

لیے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا''۔

''نہیں نہیں کہیئے''۔

''مجھے تو یہ انجام بھی اتنا غیر قدرتی معلوم ہوتا ہے جتنا پہلا''۔

''کم از کم پہلے انجام کی نسبت یہ کم غیر قدرتی معلوم ہوتا ہے''۔

''ہاں''۔

''تو پھر آپ انجام کے دو چار سین پھر لکھ دیجئے''۔

''بہتر''۔

انجام کے سین دوبارہ لکھے گئے۔ ان میں ایک سین میں نے پندرہ بار لکھا۔ اس سین کو پڑھنے کے بعد ڈائریکٹر صاحب کہنے لگے۔ ''اگر مکالمے کی بجائے دوگانا رکھ دیا جائے تو کیسا رہے۔'' میں نے بے دلی سے کہا۔ ''دوگانا بھی ہوسکتا ہے۔'' کہنے لگے۔ ''تو یہ سین رہنے دیجئے۔ میں مدھو پال جی سے کہہ دوں گا کہ ایک دوگانا اور لکھ دیں''۔

جب میں نے بمبئی کو خیر باد کہا تو ڈائریکٹر صاحب اسٹیشن پر مجھے وداع کرنے آئے اور فرمانے لگے ''میں رات کو چند سینوں کے مکالمے پڑھ رہا تھا، مجھے محسوس ہوا کہ ان میں ابھی اصلاح کی کافی گنجائش ہے، آپ کو تکلیف تو ہوگی لیکن انہیں اپنے ساتھ لیتے جایئے اور لاہور جا کر انہیں ایک بار پھر لکھیئے''۔ اور پیشتر اس کے کہ میں ہاں یا نہ کرسکتا انہوں نے بیس پچیس صفحات کا مسودہ میرے بڑے کوٹ کی جیب میں ٹھونس دیا۔

☆☆☆

جہاں گرد

کہتے ہیں جب رانجھا جوگی کے بھیس میں پہلے بار جھنگ میں داخل ہوا تو پنگھٹ پر کھڑی ہوئی کنواریوں میں اس کے متعلق عجیب قسم کی چہ میگوئیاں ہوئیں۔ ایک نے کہا۔ ''بہروپیا ہے''۔ دوسری بولی۔ ''نوجوان لڑکیوں کو بہکانے آیا ہے''۔ تیسری نے آہستہ سے کہا۔ ''عشق کی چاٹ لگی ہے''۔ غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ دیویندر ستیارتھی کی شخصیت کے متعلق بھی اسی قسم کے عجیب انداز لگائے گئے ہیں۔ کسی کی دانست میں وہ تارک الدنیا ہے۔ کوئی

ٹیگور کا چربہ بتاتا ہے اور کوئی خواجہ حسن نظامی کا ہندو ایڈیشن۔ یہ سب غلط فہمیاں اس کی ڈاڑھی اور لمبی لمبی جٹاؤں سے پیدا ہوئی ہیں۔

میں نے ستیارتھی کو ہر رنگ میں دیکھا ہے۔ جب اس نے ڈاڑھی کٹوالی اور بزرگ کی بجائے چھوکرا نظر آنے لگا اور اب کہ اس نے پہلی اور دوسری ہیئت میں سمجھوتہ کر لیا اور اس پر عربی یا مجازی درویش کا دھوکا ہوتا ہے۔ بیشتر دوستوں کی نگاہ میں ''ستیارتھی فقط ڈاڑھی ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ ڈاڑھی جمع زلفیں''۔ میں نے ستیارتھی کو کبھی محض ''ڈاڑھی'' نہیں سمجھا۔ ڈاڑھی کے علاوہ بڑی بڑی ''روشن آنکھیں'' اور ''پیاری پیاری دلکش آواز'' بھی ہے۔ ڈاڑھی کے علاوہ وہ دماغ بھی ہے، سوچنے اور سمجھنے والا دماغ، لوگوں کو انگلیوں پر نچانے والا دماغ، جن تلوں میں تیل نہیں ان سے تیل نکالنے والا دماغ۔ اور اردو افسانہ نویسی میں ایک نئے سکول کی داغ بیل ڈالنے والا دماغ۔

ازل سے اس کے پیر میں چکر ہے اور ابد تک رہے گا۔ اسے خضر کی طرح گھومنے میں لطف آتا ہے۔ اگر آج وہ لنکا کے ساحل پر کھڑا لہریں گن رہا ہے تو کل ہمالہ کی یخ بستہ چوٹی پر برفانی تودوں سے نبرد آزما ہے۔ آوازیں اسے پکارتی ہیں۔ گھنگھروؤں کی چھن چھن چھنا چھن۔ طبلے اور ڈھولوں کی دھم دھم دھما دھم۔ ان آوازوں کے تعاقب میں وہ صحراؤں کو چیرتا، دریاؤں کو پیرتا اور پہاڑوں کو پھاندتا کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔ وہ گونڈوں میں گونڈ، بھیلوں میں بھیل اور سنتھالوں میں سنتھال بن کر رہتا ہے۔ اس لامتناہی سفر میں اس کا صرف ایک ساتھی، اس کی ڈاڑھی۔

اس ڈاڑھی کی آڑ میں وہ عجیب و غریب شکار کھیلتا ہے۔ اس ڈاڑھی کے سہارے وہ الھڑ کنواریوں کے جھرمٹ میں جا کھڑا ہوتا ہے۔ شرمیلی دلہنوں سے گھونگھٹ اٹھانے کو کہہ دیتا ہے۔ بیٹیوں اور بہوؤں سے ہنسی ٹھٹھے کرتا ہے اور جب اس کی جیبیں خالی ہوتی ہیں تو بلا ٹکٹ سفر بھی کر لیتا ہے۔

اس نے راجپوتانے کی تپتی ہوئی ریت پر تھکے ہوئے پاؤں رکھے ہیں، گلگت کی یخ بستہ برف کو سینے سے لگایا ہے، بپھری ہوئی لہروں سے دست و گریبان ہوا ہے۔ اس کے طویل سفر میں کئی مواقع ایسے بھی آئے ہیں، جب وہ کھلی ہوا میں سخت اور پتھریلی چٹانوں پر آسمان کی چھت

تلے سویا۔ کئی بار ستاروں نے آنکھیں جھپک کر اس سے پوچھا۔ ''پگلے! تمہارے دماغ میں یہ کیا خبط سمایا ہے۔ لوک گیت جمع کرو گے؟ چاہے تمہیں عمر خضر نصیب ہو۔ تو بھی اس طویل و عریض سرزمین کے گیت جمع نہیں کر سکتے'' لیکن صرف ستارے ہی اس سے یہ سوال نہیں کرتے۔ بارہا سڑکوں پر چلتے ہوئے لوگوں نے اس کی ڈاڑھی کو جھنجھوڑ کر یہ تسلی کرنے کے بعد کہ وہ واقعی مصنوعی نہیں، اس سے پوچھا ہے..... ''تم لوک گیت کیوں جمع کرنا چاہتے ہو؟ کیا تم کسی کمپنی کے ایجنٹ ہو؟ تمہیں ان گیتوں سے مالی فائدہ بھی ہوگا؟''

وہ ان سوالوں کا کچھ جواب نہیں دیتا۔ خاموش، چپ چاپ، تنہا، ہندوستان کی کبھی نہ ختم ہونے والی شاہراہوں پر گامزن ہے۔ ایک جنون، ایک بے نام تڑپ، اسے ہر وقت مضطرب رکھتی ہے۔ ہندوستان میں وہ واحد ادیب ہے۔ جسے ٹیگور کا قرب، پریم چند کی رفاقت۔ سروجنی نائیڈو کی تحسین، گاندھی کی شفقت اور چودھری نذیر احمد کی سرپرستی نصیب ہوئی۔ اس کے باوجود وہ مظلوم ترین فن کار ہے۔ لوگ اس کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ عورتیں اسے دیکھ کر زیر لب مسکراتی ہیں۔ وہ شخص جنہوں نے ایک سطر نہیں لکھی۔ جنہوں نے گھر سے باہر ایک قدم نہیں رکھا، اس پر پھبتیاں کستے ہیں۔ اس کے خلوص کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہیں اور وہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ لوک گیت جمع کر کے اس نے کتنا بڑا کام کیا ہے۔

بادی النظر میں لوک گیت ایک بیکار، بے مصرف سی چیز ہے۔ آخر لوگ گیتوں میں ہے کیا؟ یہ ہے گیتوں کے متعلق ایک عام آدمی کا ردعمل۔ عام آدمی کی بات چھوڑیئے۔ کبھی کبھی تو ایک ذہین قاری کو بھی یہ شک گزرتا ہے کہ لوک گیت جیسی حقیر صنف پر وقت صرف کرنا بوالعجبی نہیں تو اور کیا ہے۔ شک کے انہی لمحوں میں میں اس سے کہتا ہوں۔

''ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ایک فضول چیز کی خاطر تم نے عمرِ عزیز کے بیس سال ضائع کر دیئے''۔

وہ اپنی مدھم اور شیریں آواز میں جواب دیتا ہے۔ ''لوک گیتوں کی عظمت کا اندازہ کچھ وہی لوگ لگا سکتے ہیں، جنہوں نے گیتوں کے جادہ کو محسوس کیا ہے۔ یہ مدھ بھرے گیت جو ان گنت صدیوں سے گاتے جا رہے ہیں، جن کا ایک ایک بول ساری قوم کو مرنے مارنے پر ابھار سکتا ہے، جن کی پرسوز تان مردہ قوم کے احساسِ خودی کو بیدار کر سکتی ہے، جن کی تند و تیز طنز ایک گئے

گزرے ملک پر تازیانے کا حکم رکھتی ہے، یقیناً اس قابل ہیں کہ انہیں منظر عام پر لایا جائے۔ تم نہیں سمجھ سکتے۔ یہ صرف ٹیگور یا صوفیا واڈیا کا دل ہی محسوس کر سکتا ہے۔ کہ اس بدقسمت ملک کو جس کا نام ''نفاقستان'' ہے، ان گیتوں کی کتنی ضرورت ہے''۔

میں مشکوک نظروں سے اس کی ڈاڑھی کی طرف دیکھتا ہوں۔ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے وہ کہتا ہے۔ ''ڈھول کی بھاری بھرکم آواز، بانسری کی مہین اور سریلی تان اور گھنگھروؤں کی سحر آفرین جھنکار میں اونچ نیچ، ذات پات، ہندو مسلمان کے تفرقات غرق ہی نہیں ہو جاتے، ہمیشہ کے لیے فنا بھی ہو جاتے ہیں۔ آزادی کا نغمہ سننے پر غلامی کی زنجیریں ڈھیلی ہی نہیں ہوتیں، ٹوٹ بھی جاتی ہیں۔ لوک گیت تو قوم کا دفینہ ہیں۔ اے دوست! ..... ایسا دفینہ جو عوام کے سینوں اور دماغوں میں مدفون ہے اور جس کی کھوج وہی لگا سکتا ہے، جو.....''

''جو بھلا چنگا انسان ہوتے ہوئے بھی قلندر نظر آئے''۔

''تم چاہے کچھ ہی کہو۔ لیکن یہ حقیقت ہے۔ ان گیتوں کی کھوج میں قلندر کی طرح ایک صوبے سے دوسرے صوبے تک گھوما ہوں۔ بھک منگوں کی طرح اپنا کشکول لے کر ہر اس شخص کے پاس گیا ہوں جو اس میں لوک گیت کی چٹکی ڈال سکتا تھا۔ میں نے جواہرات کی مانند ان گیتوں کی قدر کی، قیمتی پتھروں کی طرح انہیں سینے سے لگایا۔ کاش تم اس بات کا اندازہ کر سکتے کہ ان گیتوں کی خاطر میں نے کس کس کے ناز اٹھائے۔ سانولی سلونی بنگالنوں کے ناز۔ خوددار گڑھوالنوں کے ناز، ہرنیوں کی مانند ہمالہ وادیوں میں چوکڑیاں بھرنے والی نیپالنوں کے ناز۔ ذرا سی بت پر چمک کر راہ گیروں پر خونی وار کرنے والے پٹھانیوں کے ناز.....''۔

اور میں جھٹ لقمہ دیتے ہوئے کہتا ہوں..... ''کالی کلوٹی میراشنوں کے ناز، نک چڑھی گستاخ نٹنیوں کے ناز، بدیوا اور تعفن میں بسی ہوئی مہترانیوں کے ناز.....''

ہندوستان کی پچاس نمائندہ زبانوں میں سوا تین لاکھ گیت جمع کرنے کے بعد وہ گھر لوٹتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں وہ گردش سے گھبرا گیا ہے۔ آخر انسان ہے۔ پیالہ وساغر تو نہیں، لیکن یقیناً وہ دم لینے کے لیے نہیں رکا۔ جب تک اس کا مقصد پورا نہ ہو جائے، وہ کیسے دم لے سکتا ہے؟ لوک گیت تو جمع ہو گئے، لیکن اصلی کام تو ابھی باقی ہے۔ ان گیتوں کی ترتیب و تدوین..... ابھی تنگ و تاریک جھونپڑی میں دیے کی مدھم لو میں بیٹھا وہ ان گیتوں کو مرتب کر رہا ہے، گرمی کی

حدت سے پسینے چھوٹ رہے ہیں۔

اس کے اردگرد ہزاروں گیت بکھرے پڑے ہیں۔ پنجاب کے گیت، ڈھولک کے نغمے، گدا اور جھومر ناچ کی تانیں، ماہیا، ڈھولا، بالو، جگا، ہرنام کو، نا بھے دیئے بند بوتلے،۔ میری گئی جھانجراں والی، راتیں یار نے گلے نال لایا، کانگڑہ اور کلو کے دل کی دھڑکنیں۔ ''باہمنادیا چھوڈآ، دھارارابسیراپانی دورارا''۔اودھ کے گیت...... گوئیاں بلموا، سجنوا کے گیت! سندر ساری مورٹیکے میں میل بھئی''۔گنگا اور جمنا کے گیت۔ ہولی اور ساون کے دلفریب ناچ، اودھی، بنارسی جونپوری ٹھمریاں۔دادرے اور دوہے''۔رتن کٹوری گھی جلے، دور لہے جلے کسار، گھونگٹ میں گوری جلے جا کے مورکھ بھرتار''۔راجپوتانے کے جنگی ترانے۔''تن تلواراں تلچھیا، تل تل اوپر سیو، آلاں گھاواں اوھسی چھن یک ٹھہر نقیب''۔ پھولوں کی خوشبو میں بسے ہوئے کشمیری گیت۔''لج پھلے اندونن چہ کٹن گوئے نامے اون'' افق کے اس پار سے آتی ہوئی بنگالی گیتوں کی پرسوز تانیں''مانشی ندیر پارے پارے او دیدی، شونا بندھو گان کورے جائے''۔ خود آفریدیوں کے آتشیں ترانے''۔تو تان پا شو پا خو ہمانے تورے، زدسرکار دردٹئی پروانہ کردم''۔ ہندوستان کی سب سے قدیم اور عجیب وغریب زبان تیلگو کے گیت......

انتخا دیمو ال اللہ ویلگو

ایسٹبر ری چند ماما جگ ملا ویلگو

انتخا دیمو میڈ ا لکا ویلگو

انتخا ما ابائی ما کٹر لا ویلگو

بنگال کا''جاری''نرت، گجرات کا''گربا''آسام کا''بہو''ناچ۔

گیتوں کی فائلوں کے انبار میں گھرا ہوا جہاں گرد ایک ایک گیت کا جائزہ لیتا ہے، تراجم کے مسودے کو گھور گھور کے دیکھتا ہے، بار بار اسے شک گزرتا ہے کہ اس نے گیت کا ترجمہ نہیں کیا۔بھرتہ کر ڈالا ہے، لیکن وہ مایوس نہیں ہوتا۔ایک لفظ کا صحیح بدل ڈھونڈھ نکالنے کے لیے وہ گھنٹوں کھو جاتا ہے۔

رات ڈھل چکی ہے۔ کائنات پر سکوت اور سناٹا چھایا ہوا ہے۔ پڑوسی خراٹے لے رہے ہیں۔ ہمسائے کی گھڑی تین بجاتی ہے۔لیکن گیتوں کے رسیا کو نیند کہاں؟ یہ کام رات کی خاموشی

میں ہی ہوسکتا ہے۔ان میں تو اسے پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے دوڑ دھوپ کرنا ہے۔افسانے لکھنے ہیں، ریڈیو سٹیشن جانا ہے، پروف دیکھنے ہیں، نہیں وہ ابھی نہیں سوئے گا، چار بجے تک اسے مرہٹی گیت کا ترجمہ کر لینا چاہیے..... ترجمہ کرتے کرتے تھک جاتا ہے۔تو اصل گیت کے بول گنگنانے لگتا ہے اور اس کے گیتوں میں ہزاروں گیتوں کے سرتال گونج اٹھتے ہیں۔معاً وہ اپنے ماحول کو بھول جاتا ہے، زمین پر پڑی ہوئی چٹائی ہوا میں اڑنے لگتی ہے اور وہ ہوا میں پرواز کرتا ہوا چاند اور ستاروں کے قریب پہنچ جاتا ہے۔فضاؤں میں دلکش اور روح پرور نغمے حوروں کی لوریوں کی طرح بکھر جاتے ہیں۔یہی جہاں گرد کی اصل دنیا ہے۔کوئی قفس، کوئی آشیانہ اسے قید نہیں رکھ سکتا۔وہ جہاں گرد ہے۔اور جہاں گرد ہی رہے گا!

☆☆☆

انکم ٹیکس والے

منکر نکیر اور محکمہ انکم ٹیکس انسپکٹروں میں یہی فرق نہیں کہ منکر نکیر مرنے کے بعد حساب مانگتے ہیں اور موخر الذکر مرنے سے پہلے، بلکہ یہ کہ منکر نکیر صرف ایک بار مانگتے ہیں اور انکم ٹیکس کے انسپکٹر بار بار۔نیز یہ کہ منکر نکیر گناہوں کا حساب لیتے وقت ثواب کو نظر انداز نہیں کرتے مگر انکم ٹیکس تجویز کرنے والے صرف گناہوں میں دلچسپی رکھتے ہیں، ثواب سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔آمدنی کو گناہ میں اشتراکیوں کی اصطلاح میں کہہ رہا ہوں۔ملاحظہ ہو ایک اشتراکی فلاسفر کا نظریہ کہ تمام ''صاحب جائیداد چور ہیں''۔

ادھر مارچ کا مہینا آیا، ادھر ان کے پیام آنے شروع ہوئے کہ صاحب ایک ہفتے کے اندر اندر اپنی آمدنی کا نقشہ پر کر کے دفتر میں بھیج دیجئے ورنہ آپ پر زیر دفعہ ''فلاں'' مقدمہ چلایا جائے گا۔اسے کہتے ہیں مفت خوری اور سینہ زوری۔بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ صاحب جب ہم سارا دن دفتر میں پنسل گھماتے تھے، افسروں کی گھرکیاں سہتے تھے، سپرنٹنڈنٹوں کے ناز اٹھاتے تھے، اس وقت آپ کہاں تھے۔کبھی پھوٹے منہ سے یہ نہ کہا۔''لاؤ ان رقموں کی میزان میں کر دوں یا اس فائل سے میں نپٹ لوں گا۔اور جب چار پیسوں کا منہ دیکھنا نصیب ہوا تو آپ آ دھمکے اور لگے رعب جمانے کہ ہمارا حصہ لاؤ۔اگر عاجزی سے مانگیں تو کوئی عیب نہیں کہ راہ خدا

ہم غریبوں کو بھی دو۔'' ہے ملی گر تم کو ثروت چند روز'' مگر یہاں تو اس کروفر سے مطالبہ کیا جاتا ہے گویا ہم کماتے ہی ان کے لیے ہیں اور یہ بیوی بچوں کا قصہ تو گویا الف لیلیٰ کی داستان ہے مگر صرف مطالبے پر ہی معاملہ ختم نہیں ہو جاتا، آمدنی کا نقشہ پر کرنے کے بعد ایک دن دفتر میں بھی تشریف لائیے تا کہ اندراج کی تصدیق کی جا سکے''۔ اور جب آپ اپنا قیمتی وقت ضائع کر کے وہاں جاتے ہیں تو آپ کی کیا گت بنائی جاتی ہے؟ برآمدے میں جہاں آپ کو گھنٹوں انتظار کرنا ہے، کوئی بنچ یا کرسی نہیں۔ دوسرے، جتنا عرصہ آپ برآمدے میں کھڑے رہتے ہیں، دفتر میں کام کرنے والے بابو اور چپڑاسی آپ کو اس طرح گھور گھور کر دیکھتے ہیں، گویا آپ جیل سے بھاگے ہوئے مجرم ہیں۔ مگر سب سے بڑی کوفت یہ کہ محکمہ انکم ٹیکس کے انسپکٹر اپنے آپ کو فرعون یا ہٹلر سے کم نہیں سمجھتے۔ اس لیے جب آپ جھک کر سلام بجالاتے ہیں تو وہ یا تو منہ دوسری طرف پھیر لیتے ہیں یا پھر سگار کا دھواں آپ کے منہ کی طرف چھوڑتے ہوئے آپ پر یوں نگاہ غلط انداز ڈالتے ہیں جیسے آپ انسان نہیں بلکہ رینگنے والے کیڑے اور اس کے بعد گستاخانہ استفسارات کا سلسلہ.....

''یہ نقشہ آپ نے پُر کیا ہے''۔

''جی ہاں''۔

''آپ ہی کا نام ہے دین دیال''۔

''جی ہاں''۔

''آپ کہاں پروفیسر ہیں''۔

''کلچرل کالج میں''۔

''آپ کی تنخواہ''۔

''ایک سو بیس روپیہ ماہانہ''۔

اور آپ دل ہی دل میں جھنجھلا کر کہتے ہیں، کم بخت اندھا ہے، پڑھ نہیں سکتا؟ نقشے میں ان سوالوں کے جوابات لکھ تو دیئے تھے۔ اس قسم کے تین چار بے ضرر سوالات کرنے کے بعد آمدم برسر مطلب والا معاملہ شروع ہوتا ہے۔

''ہاں تو آپ نے تنخواہ کے علاوہ اپنی بالائی آمدنی کیوں نہیں دکھائی''۔

''جناب'' آپ منکسرانہ لہجے میں کہتے ہیں۔ ''تنخواہ کے علاوہ میری کوئی اور آمدنی نہیں''۔

''ہوں''۔ وہ منہ سے پائپ یا سگار نکال کر طنزیہ انداز میں فرماتے ہیں۔

''اور وہ جو جناب نے ''کبوتر نامہ'' لکھا تھا، اس کی رائلٹی کیا ہوئی''۔

''جی کیا عرض کروں، بندہ پرور۔ سال بھر میں کل تین کاپیاں فروخت ہوئیں، جن پر ساڑھے تیرہ آنے رائلٹی ملی''۔

''ساڑھے تیرہ آنے سے مطلب نہیں''۔ وہ گرج کر فرماتے ہیں۔ ''آمدنی کے نقشے میں اسے بھی دکھانا چاہئے''۔

آپ دبی زبان سے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں۔ وہ غرا کر پھر پوچھتے ہیں۔

''اور وہ جو آپ کو ریڈیو سے معاوضہ ملا، وہ کیوں نہیں دکھایا''۔

''اجی حضرت وہ کیا معاوضہ تھا۔ اڑھائی منٹ کے لیے بچوں کے فیچر پروگرام میں گیدڑ کا پارٹ ادا کیا تھا، جس کے اڑھائی روپے ملے۔ اب میں وہ کیا آمدنی کے نقشے میں دکھاتا''۔

وہ اسی فرعونیت کے ساتھ جواب دیتے ہیں۔

''کچھ بھی ہو اندراج مکمل ہونا چاہیے''۔

چند ثانیوں کی اذیت بخش خاموشی کے بعد وہ پھر آپ سے مخاطب ہوتے ہیں ''ہاں اور وہ جو آپ رائے بہادر مستیامل کی لڑکی کو بطور معلم پڑھاتے رہے، وہ ٹیوشن فیس آپ نے درج نہیں کی''۔

''جناب رائے بہادر بیس روپے ماہوار ہی تو دیتے تھے اور ان کی کوٹھی تھی غریب خانے سے چھ میل دور۔ پندرہ روپے ماہوار تانگے والا لے لیتا باقی رہے پانچ، ان سے بمشکل سگریٹ پان کا خرچ چلتا''۔

مگر وہ دھاڑ کر کہتے ہیں۔ ''آمدنی آمدنی ہے۔ پانچ ہو یا پچاس''۔

اور آپ بے حد مرعوب ہو کر سوچنے لگتے ہیں، یہ کم بخت انکم ٹیکس والے حساب دان ہونے کے علاوہ غضب کے سراغ رساں بھی ہیں۔ آپ کی آمدنی کے متعلق آپ سے بھی زیادہ جانتے ہیں، حالانکہ آپ نے صرف ریڈیو والوں کی لاج رکھنے کے لیے اڑھائی روپے کی گراں قدر رقم کا ذکر نہ کیا تھا اور اگرچہ ''کبوتر نامہ'' کی رائلٹی آپ کے ذہن سے بالکل اتر چکی ہے مگر اب

سب کچھ یاد ہے۔ آپ کی آمدنی کے تمام ذریعوں کا انہیں پتہ ہے۔ آپ یہ سوچ ہی رہے ہوتے ہیں کہ وہ لال آنکھیں نکال کر کہتے ہیں۔ ''آپ کو معلوم ہے، آمدنی چھپانا جرم ہے''۔ اور پیشتر اس کے کہ وہ آپ کو تعزیرات کی اس دفعہ کا حوالہ دے سکیں جس کے ماتحت آپ کو گرفتار کیا جاسکتا ہے، آپ معافی مانگنے پر اتر آتے ہیں۔ اور یہ ہے وہ بات جس پر انکم ٹیکس کے انسپکٹروں کو ناز ہے کہ کلچرل کالج کا پروفیسر دین دیال جو ایم۔ اے ہونے کے علاوہ ایل ایل بی بھی ہے، ان سے گڑگڑا کر معذرت کر رہا ہے۔ اور اصل اسی امر کے لیے تو آپ کو دفتر میں طلب کیا گیا تھا، تا کہ انسپکٹر صاحب اپنے احباب میں مونچھوں پر تاؤ دے کر کہہ سکیں۔ ''اجی ہماری موجودگی میں بڑوں بڑوں کے زہرے آب ہو جاتے ہیں۔ پرسوں کلچرل کالج کے ایک پروفیسر کو اتنا دھمکایا کہ بے چارہ تھر تھر کانپنے لگا.....''

سگار کے دو چار کش اور لگانے کے بعد وہ آپ کی معذرت قبول فرما لیتے ہیں۔ جس کا پتا اس بات سے چلتا ہے کہ وہ آپ کو بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کرتے ہیں، مگر رخصت ہوتے وقت یہ خوشخبری آپ کے گوش گزار کی جاتی ہے کہ انہوں نے آپ کی حالت زار پر رحم کھاتے ہوئے صرف ایک سو بیس روپیہ انکم ٹیکس تجویز کیا ہے۔ جو کہ آپ کی ایک مہینا کی پوری تنخواہ ہے۔ اس پر بھی آپ ناراض ہونے کی بجائے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ مگر جب گھر لوٹتے ہیں تو دل ہی دل میں کہتے ہیں۔ ''آمدنی آمدنی ہے۔ پانچ ہو یا پچاس۔ خوب مگر کیا خرچ نہیں۔ پانچ سو ہو یا پانچ ہزار'' اور اس وقت آپ کا جی چاہتا ہے کہ کاش یہ زبان دراز افسر آپ کے اخراجات کا بھی جائزہ لے سکتا اور جیسے اسے آپ کی آمدنی کے تمام ذرائع معلوم ہیں۔ کاش اسے آپ کے خرچ کی تفاصیل بھی اسی طرح ازبر ہوتیں۔ کاش اسے یہ پتا ہوتا کہ آپ کی آدھی سے زیادہ آمدنی بیوی کی ساڑھیوں پر خرچ ہوتی ہے۔ ایک چوتھائی آپ کے فیملی ڈاکٹر کی جیب میں چلی جاتی ہے اور اگر آپ کا ہمسایہ آپ کو قرض نہ دے تو شاید آپ کو کسی یتیم خانے کی پناہ لینی پڑے۔ اور آپ سرد آہ کھینچ کر کہتے ہیں۔ صرف ایک سو بیس روپے انکم ٹیکس تجویز کرنے والے مہربان، اگر تجھے واقعی میرے اخراجات کا علم ہوتا تو انکم ٹیکس تجویز کرنے کی بجائے گورنمنٹ سے مجھے سپیشل وظیفہ دلواتا۔ مگر افسوس تو یہی ہے کہ تجھے میرے اخراجات کا علم نہیں۔

☆☆☆

چڑیا گھر

فرشتے نے ایک ساتھی سے کہا۔ ''اب میں تمہیں دنیا کے سب سے بڑے چڑیا گھر کی سیر کراؤں گا''۔ تھوڑی دیر اور فضا میں اڑنے کے بعد دونوں ایک وسیع و عریض چڑیا گھر میں داخل ہوئے۔ اس میں متعدد پنجرے تھے جن میں طرح طرح کے پرندے اور جانور مقید تھے۔ فرشتے نے سب سے پہلے اپنے ساتھی کو ایک جانور دکھایا۔ سر صفا چٹ، ٹھوڑی پر لمبے لمبے بال، دم بالکل غائب، پنجرے کے باہر لکھا ہوا تھا۔ ''اس پنجرے کے نزدیک قینچی یا استرے لے جانا سخت منع ہے۔'' ساتھ والے پنجرے میں ایک مادہ قید تھی۔ وہ کپڑے کے غلاف میں اس طرح لپیٹی گئی تھی کہ یہ پتا چلانا مشکل تھا یہ غلاف ہے یا کفن۔ فرشتے کے ساتھی نے پوچھا۔ ''یہ غلاف کو اتار کیوں نہیں پھینکتی''۔ فرشتے نے کہا۔ ''اس لیے کہ اسے ہوا نہ لگ جائے''۔ چلتے چلتے فرشتہ اور اس کا ساتھی طوطوں کے پنجرے کے سامنے رکے۔ دیکھا کہ طوطے آپس میں بڑے جوش و خروش سے سے لڑ رہے ہیں۔ کچھ طوطے کہتے تھے، اس چڑیا گھر کی ایک ہی بولی ہونے چاہیے اور وہ ہے ''ارار''، باقی کہتے تھے اس چڑیا گھر کی صرف ایک ہی بولی ہو سکتی ہے اور وہ ہے ''ہن ہن''۔ ''ارار'' والے کہتے ''ارار'' بولنا مقابلتاً سہل ہے، ''ارار'' میں بہت مٹھاس ہے''۔ اس پر ''ہن ہن'' ہی ''ارار'' کو جنم دیا۔ ''ہن ہن'' ماں ہے اور ''ارار'' بیٹی۔ ہم بوڑھی ماں کو چھوڑ کر جوان بیٹی کی کبھی طرفداری نہ کریں گے۔ اس کے بعد وہ پھر لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ ادھر سے ایک جماعت پکارتی ''ارار'' ادھر سے دوسری چلا کر کہتی، ''ہن ہن'' فرشتے کا ساتھی یہ تماشا دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس سے اگلے پنجرے میں کچھ گیدڑ اس طرح غرا رہے تھے گویا وہ گیدڑ نہیں شیر ہیں۔ گیدڑوں کا لیڈر غرا کر کہتا۔ ''ہم بہادر ہیں کیونکہ ہمارے بزرگ بہادر تھے''۔ باقی گیدڑ کہتے ''کیا ہوا ہم آج گیدڑ کہلاتے ہیں، ایک زمانہ تھا کہ شیر اور چیتے ہم سے خوف کھاتے تھے۔ فرشتے کا ساتھی مسکرایا اور کہنے لگا۔ ''یہ کیا بوالعجبی ہے''۔ فرشتے نے کہا۔ ''اس چڑیا گھر میں اس سے بڑی بوالعجبیوں کی مثالیں ملتی ہیں''۔ اس پنجرے سے تھوڑے سے فاصلے پر چند خرگوش اس موضوع پر بحث کر رہے تھے کہ پنجرے کا مالک کون ہے۔ سفید رنگ کے خرگوش کہتے۔ ''ہم، کیونکہ ہم بعد میں آئے۔'' پنجرے کے اصلی مالک جو رنگ کے کالے تھے، پنجرے کے جنوبی

اور مشرقی کونوں میں دبک کر بیٹھے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی وہ پکار اٹھتے۔ ''پنجرے کے مالک نہ سفید خرگوش ہیں نہ خاکی رنگ کے بلکہ ہم ہیں۔ تم سب غاصب ہو۔ حتیٰ کہ چڑیا گھر کا موجودہ مالک بھی غاصب ہے''۔

فرشتہ اور اس کا ساتھی اب ایک ایسے پنجرے کے قریب آئے جس میں بہت سے دم کٹے بندر اس لیے برسرِ پیکار تھے کہ بندر کی قدرتی خوراک سبزی ہے یا گوشت۔ بہت سے بندر سبزی کے حق میں تھے مگر چند بندروں کو گوشت پسند تھا۔ چنانچہ سبزی پسند بندر گوشت خور بندروں کو ناپاک سمجھتے تھے۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ جن بندروں کو گوشت پسند تھا، ان کے بھی دو گروہ تھے۔ ایک گروہ سمجھتا تھا کہ اس جانور کا گوشت اچھا ہے جسے آہستہ آہستہ موت کی نیند سلایا جائے۔ دوسرا گروہ کہتا کہ اس جانور کا گوشت کھانا چاہیے جس کا کام تمام جلدی جلدی کیا جائے۔

اس پنجرے سے تھوڑی دور ایک ایسا پنجرہ آیا جس پر لکھا ہوا تھا۔ ''خطرہ''۔ فرشتے کے ساتھی نے اس پنجرے کے قریب جانا چاہا مگر فرشتے نے اسے پیچھے کھینچتے ہوئے کہا۔ ''اس پنجرے سے دور رہنے۔ اس میں ''ناپاک بندر'' قید ہیں''۔ فرشتے کے ساتھی نے حیرانی سے کہا۔ ''ناپاک بندر؟'' فرشتے نے جواب دیا۔ ''ان بندروں کو چھونے سے معزز بندر ناپاک ہو جاتے ہیں، اس لیے انہیں ایک علیحدہ پنجرے میں بند کیا گیا ہے۔ یہ بندر اتنے خطرناک ہیں کہ ان کا سایہ بھی کسی معزز بندر پر پڑ جائے تو وہ ناپاک ہو جائے گا''۔ فرشتے کے ساتھی نے پوچھا۔ ''یہ بندر شکل وصورت میں تو بالکل معزز بندروں کی طرح ہیں۔ پھر انہیں ناپاک کیوں قرار دیا گیا ہے''۔ فرشتے نے کہا۔ ''تم ابھی اس چڑیا گھر کی بوالعجبیوں کا ذکر کر رہے تھے۔ سمجھ لو، یہ بھی ایک بوالعجبی ہے''۔

اس سے آگے ایک پنجرہ آیا جس کے وسط میں ایک چھوٹی سی مصنوعی پہاڑی تھی۔ پہاڑی کے اوپر روشنی کا ایک خوبصورت منار بنا ہوا تھا۔ اس منار تک پہنچنے کے لیے متعدد راستے تھے۔ پنجرے کے جانور ان مختلف راستوں پر چلتے ہوئے منار تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ اگرچہ تمام راستے منار کے پاس آ کر مل جاتے تاہم سب جانور اس بات پر جھگڑ رہے تھے کہ کونسا راستہ اچھا ہے، اور کونسا برا حالانکہ تمام راستے ایک دوسرے کے بالکل

مشابہ تھے۔فرشتے کے ساتھی نے دیکھا کہ پہاڑی پر چڑھنے کی بجائے یہ سب جانور آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔فرشتے نے آہستہ سے اپنے ساتھی کے کان میں کہا۔''اگر یہ جانور لڑنا جھگڑنا بند کر دیں تو شاید منار تک پہنچ جائیں''۔

اب صرف ایک پنجرہ باقی رہ گیا تھا۔فرشتے نے کہا۔''آؤ لگے ہاتھوں اسے بھی دیکھ لیں۔'' دونوں اس پنجرے کے پاس آئے اور ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ایک دم کٹا بندر پنجرے میں ٹانگوں کے بل کھڑا تھا۔اس کے پاس ایک تھیلا تھا جس میں روٹیاں اور بھنی ہوئی مچھلیاں تھیں۔ اس تھیلے سے وہ ایک روٹی نکالتا اور پنجرے میں بند کتوں کو دکھاتا۔کچھ کتے اس کے قریب آتے اور خوب دم ہلا ہلا کر اپنی محبت کا ثبوت دیتے۔چند ایک اس کے قدموں میں لوٹ پوٹ ہو جاتے۔کچھ اس کے گرد ناچنا شروع کر دیتے۔اس پر وہ بندر ایک آدھ ٹکڑا یا بھنی ہوئی مچھلی ان کی طرف پھینک دیتا۔

باقی کتے یہ دیکھ کر شور مچاتے اور کہتے''بندر ان کتوں کے ساتھ زیادہ مہربانی سے پیش آتا ہے''۔اس پر بندر چیخ کر کہتا۔''تم بھی دم ہلاؤ، تمہیں بھی روٹیاں اور مچھلیاں ملیں گی''۔وہ کتے زور زور سے دم ہلانا شروع کرتے۔تب کتوں کی پہلی جماعت بھونکنے لگتی اور کہتی۔''ہم ان کتوں سے کہیں زیادہ زور کے ساتھ دُم ہلا سکتے ہیں، روٹیاں اور مچھلیاں ہمیں ملنی چاہئیں''۔بندر ان کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہتا۔''شاباش، نمک حلال کتو، شاباش''۔اور ان پر روٹیوں اور مچھلیوں کی بارش کر دیتا ہے۔

فرشتہ اور اس کا ساتھی بہت دیر تک اس نظارے سے محظوظ ہوتے رہے۔آخر فرشتے کے ساتھی نے کہا۔''عجیب جانور ہیں''۔

فرشتے نے جواب دیا۔''نہایت عجیب''۔

دفعتاً گھڑی نے چار بجائے تو فرشتہ اور اس کا ساتھی پھر فضا میں پرواز کرنے لگے۔

☆☆☆

مداح

اٹھارویں صدی کے علماء کی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر جانس اپنے ایک شعر میں فرماتے ہیں۔ ''ان بے چاروں کے لیے کیا کیا مصیبتیں ہیں۔ محنت شاقہ، پیشہ وارانہ رقابت، سرپرست کی تلاش، غربت اور آخر میں جیل!'' جب میں ڈاکٹر جانس کا یہ شعر پڑھتا ہوں تو میرے ذہن میں فوراً بیسویں صدی کے ہندوستانی ادباء کی مشکلات کا خیال آتا ہے اور میں بے اختیار پکار اٹھتا ہوں۔ ''آہ بے چارے ہندوستانی ادیب! ان کے لیے کیا کیا آفتیں ہیں۔ ایڈیٹر، ناشر، آل انڈیا ریڈیو، تعزیرات ہند اور اصفہانی خنجر!'' میں نے یہ پانچ آفتیں اس لیے نہیں گنوائیں کہ پانچوں انگلیوں کی طرح یہ برابر نہیں ہوتیں۔ بلکہ اس لیے کہ ڈاکٹر جانس سے تو ارد منظور تھا۔ ورنہ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس فہرست میں دو آفتوں کا آسانی سے اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ یعنی ہندوستانی نقاد اور ہندوستانی مداح!

نقادوں کے متعلق میرا نظریہ ہے کہ حسینوں کی طرح ع

نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دشمنی اچھی

اگر دوست نوازی پر اتر آئیں تو آپ کا موازنہ شیکسپیئر، مولیر، برنارڈ شا سے کر ڈالیں۔ نہیں تو کم از کم آپ کو ہندوستانی موپاساں اور چیخوف بنا کر دم لیں اور اگر کسی وجہ سے ناراض ہو جائیں تو پھر جو کر گزریں تھوڑا ہے۔ بے چارے کیٹس کو کہہ دیں کہ صاحبزادے شعر گوئی ترک کرو اور کمپونڈری سیکھو اور شیلے کو مشورہ دیں کہ میاں کوئی کام کی بات کرو۔ خلا میں خوبصورت پر پھڑ پھڑانے سے فائدہ؟ خیر نقادوں کو تو آدمی یوں بھی نظر انداز کر سکتا ہے کہ ان کی پیش گوئیاں اکثر غلط ثابت ہوتی ہیں لیکن اس ساتویں آفت سے پیچھا چھڑانا مغنی رکھتا ہے۔

سجاد حیدر صاحب فرماتے ہیں۔ مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ۔ میں کہتا ہوں دوستوں سے میں نمٹ لوں گا۔ مجھے میرے مداحوں سے بچاؤ۔ خاص کر ان مداحوں سے جو اپنی رائے کا اظہار فقروں اور جملوں کی بجائے مسکراہٹوں اور قہقہوں میں کرتے ہیں۔ ''خوب لکھتے ہیں آپ۔ ہی ہی ہی۔ کمال کرتے ہو بھئی ہاہاہا۔ اجی کیا بات ہی آپ کی قہ قہ قہ''۔ اور ان سے بڑھ کر ان مداحوں سے جو آپ کی تعریف اس انداز سے کرتے ہیں کہ اس پر مذمت کا گمان ہوتا

ہے۔''صاحب بہت اچھا لکھتے ہیں آپ...... ہاں ذرا زبان کی طرف تھوڑی سی توجہ اور دیجیے گا، واقعی منفرد ہیں اپنے رنگ میں...... محاوروں کے استعمال میں ضرور احتیاط سے کام لیجیے گا۔ایک بار ہمت کر کے ''فسانہ آزاد'' پڑھ ڈالیے۔ ہاں آپ نے ایک مضمون میں ''کھودا پہاڑ نکلی چوہیا'' لکھا ہے ''نکلا چوہا'' چاہیے تھا اور ہاں قطرہ قطرہ بود بسیار غلط ہے۔قطرہ قطرہ شود بسیار، درست محاورہ ہے۔خیر یہ معمولی فرد گزاشتیں ہیں۔خوب لکھتے ہیں آپ''۔

اور پھر خدا ان مداحوں سے بچائے جنھیں آپ سے غائبانہ تعارف حاصل ہے اور جن سے آپ کا تصادم کسی ادبی بزم میں یا سر راہے گاہے گاہے ہوتا ہے۔''اچھا صاحب آپ ہیں مسٹر کافور، میں تو سمجھتا تھا۔ڈنٹر پیل کرارے جوان ہوں گے۔ یہ سینہ ہوگا۔(اپنا سینہ پھلا کر) یہ بڑی بڑی مونچھیں، یہ لمبی ناک، یہ موٹی موٹی آنکھیں۔پھرا ابھرا جسم۔توبہ! آپ تو بالکل مدقوق نظر آتے ہیں۔ بہر حال بہت مسرت ہوئی آپ سے مل کر''۔ تاہم ایسے مداح بھی برداشت کیے جاسکتے ہیں لیکن ان مداحوں کا کیا کیا جائے جو آپ سے پہلی ملاقات میں بے تکلف ہو جاتے ہیں۔

''صاحب! میں تو آپ کا عاشق ہوں۔بھئی میں آپ کا قتیل ہوں''۔اور آپ ان کی بھونڈی شکل، لمبے لمبے دانت اور چپٹی ناک دیکھ کر سوچنے لگتے ہیں کہ اس رشکِ یوسف سے عشق بھایا بھی جاسکے گا یا نہیں''۔

ان کے علاوہ وہ مداح ہیں جو اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے آپ کی تعریف کے پل اندھتے ہیں۔ایک آوارہ مزاج، آشفتہ حال شخص، جس کے چہرے سے نحوست برس رہی ہے، علی الصباح آپ کے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔

''آداب عرض کافور صاحب''۔

''آداب عرض''۔

''مداخلت کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ خاکسار انتہا ناگپوری ہے۔ پہلے ابتدا تخلص کرتا ما۔ پھر کچھ عرصہ ناخدا کے نام سے کلام چھپتا رہا''۔

''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر''۔

اور خاکسار کی خوشی کا تو آپ اندازہ کر ہی نہیں سکتے۔خاکسار آپ کا غائبانہ مداح ہے۔

خاکسار نے آپ کی تمام کتابیں پڑھی ہیں۔ ٹوٹے ہوئے تارے، ہوائی قلعے، المنظر،.....

''معاف کیجئے انتہا صاحب۔ میں ان میں سے کسی کتاب کا مصنف نہیں۔ اول الذکر دو کرشن چندر کی تصنیفات ہیں اور موخر الذکر جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ نام ہے میاں بشیر احمد کی کوٹھی کا''۔

''اوہ معاف کیجئے۔ تو آپ شاعر ہیں۔ میں نے گذشتہ ہفتہ آفتاب، میں آپ کی غزل پڑھی تھی ع

زمین کچھ گھومتی سی آج پھر معلوم ہوتی ہے

''معاف کیجئے۔ میں شعر نہیں کہتا''۔

''اچھا تو شاید آپ مضمون لکھتے ہیں''۔

''جی ہاں! یہ سمجھ لیجئے''۔

''تو بات یہ ہے کافور صاحب کہ میں آپ کو تھوڑی سے تکلیف دینا چاہتا ہوں وہ ہیں نا حنیف صاحب سانگ پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کے ڈائریکٹر۔ سنا ہے آپ کے دوست ہیں، تو عرض یہ ہے کہ آپ ان سے میری سفارش کیجئے گا''۔

''سفارش؟ کس قسم کی سفارش''۔

''دیکھیے کافور صاحب۔ حنیف صاحب نے گزشتہ ماہ میرے ساتھ سخت نا انصافی کی۔ بات یوں ہوئی کہ اجنالہ میں انہوں نے سانگ پبلسٹی کے زیر اہتمام ایک مشاعرہ منعقد کیا، جس میں بنجر ویران آبادی نے رباعی پڑھی اور خاکسار نے پچھتر اشعار کی غزل۔ اب بنجر صاحب کو تو بیس روپے ملے اور خاکسار کو صرف ساڑھے سات۔ دیکھیے کافور صاحب، یہ ظلم ہے۔ اگر آٹھ آنہ فی شعر بھی دیتے تو ساڑھے پینتیس کا خاکسار حقدار تھا.....''

یا پھر یوں کہ ایک معمر آدمی اپنی نوجوان بیٹی کی معیت میں شام کے آٹھ بجے آپ کے دروازے پر دستک دیتا ہے۔

''نمستے کافور صاحب''۔

''نمستے''۔

''میں ہوں رام دیال۔ آپ کے محلہ سے تھوڑی دور رہتا ہوں۔ محکمہ جنگلات میں کلرک

ہوں اور یہ میری بیٹی چنبیلی۔ بیٹی نمستے کرو کافور صاحب کو''۔

''نمستے''۔

''نمستے''۔

''کافور صاحب بہت دنوں سے خواہش تھی کہ آپ کے درشن کروں۔ آپ نے تو اردو میں غضب کر دیا''۔

''آپ کی نوازش ہے''۔

''میں نے تربیون میں آپ کی کتاب کا ریویو پڑھا تھا۔ کیا تھا کتاب کا نام چنبیلی بیٹی یاد ہے کچھ؟''۔

''شیشے پہ شوشہ''۔

''ہاں ہاں شیشے پہ شوشہ۔ بھئی خوب۔ پرماتما کی قسم خوب نام ہے۔ میں کہتا ہوں پروفیسر صاحب، آپ کو ایسا عجیب نام سوجھا کس طرح''۔

''جی ہاں۔ بہت عجیب نام ہے۔ فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں''۔

''خدمت ودمت کچھ نہیں۔ مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ ذرا دروازے اور روشندان بند کر دیجئے۔ بات یہ ہے کافور صاحب میری لڑکی چنبیلی متواتر تین سال سے انگریزی کے پرچہ میں فیل ہو رہی ہے۔ اس سال اس نے پھر امتحان دیا ہے، اور خوش قسمتی سے آپ ممتحن ہیں۔ میرا مطلب ہے اگر آپ مہربانی کریں تو......''

''بہت اچھا۔ بہت اچھا۔ مجھ سے جس قدر مدد ہو سکے گی، کروں گا''۔

''شکریہ شکریہ۔ اچھا کافور صاحب اگر آپ کے پاس ''شیشے کا شوشہ'' کی ایک آدھ کاپی ہو تو مجھے عنایت فرمائیں۔ آج کل میرے پاس فالتو وقت ہے......''۔

مداحوں کی آخری قسم ان لوگوں پر مشتمل ہے، جو وقت بے وقت آپ کو مضامین کے عنوانات اور مواد مہیا کرتے ہیں۔ ''کافور صاحب آپ نے خوانچہ والوں پر کچھ نہیں لکھا۔ کافور صاحب! آپ جمعداروں پر کیوں مضمون نہیں لکھتے، دیکھیے میں آپ کو دلچسپ بات سناتا ہوں۔ میری چھوٹی لڑکی، اس کی عمر چار سال ہے۔ مفلر کو کفلر کہتی ہے۔ ہی ہی ہی۔ اس پر ضرور کچھ لکھئے اور میرا چھوٹا لڑکا ریڈیو کو لیڈیو کہتا ہے۔ ہا ہا ہا۔ بھئی خوب۔ لیجئے آپ کو ایک مضمون کا

مواد مل گیا''۔

''صاحب اس دن عجیب مضحکہ خیز واقعہ پیش آیا۔ دیکھیے کانفور صاحب! اس کا ذکر ضرور کسی مضمون میں کیجئے۔ میں اسٹیشن پر ذرا دیر سے پہنچا۔ گاڑی چھوٹ چکی تھی..... لپک کر زنانہ ڈبا میں جا بیٹھا۔ جب ہوش وحواس درست ہوئے تو لگا عورتوں کی طرف دیکھنے۔ ایک عورت نے چلا کر کہا۔ ''بھئی یہ تو زنانہ ڈبا ہے''۔ میں فوراً جواب دیا۔ ''محترمہ! مجھ میں آپ کو کونسا مردانہ پن نظر آیا۔ ہی ہی ہی۔ وہ عورت کباب ہوگئی''۔

''کانفور صاحب! اس دن میں اور جمیل صاحب ایک مغنیہ کے ہاں گانا سننے گئے۔ اتفاق سے بائی جی کی طبیعت ناساز تھی۔ بالا خانہ میں بائی جی کی بوڑھی خالہ بیٹھی تھیں۔ جمیل کو جو شرارت سوجھی۔ کہنے لگا۔ ''بڑی بی آج تم ہی کوئی چیز سناؤ''۔ وہ بوڑھی بلا کی حاضر جواب تھی۔ کہنے لگی:

''بیٹا! میں کیا گاؤں گی اس عمر میں۔ دو ایک روز میں تمہاری بہن روبصحت ہو جائیں گی۔ پھر سارے ارمان نکال لینا۔ ہاہاہا۔

کانفور صاحب اس پر ایک مضمون ضرور لکھئے گا۔

اور بے چارے کانفور صاحب سر جھکا کر جواب دیتے ہیں۔ ''لکھیں گے صاحب ضرور لکھیں گے''۔

☆☆☆

عمریوں گزرتی گئی

گزرنے کو تو عمر گزر رہی ہے اور گزر جائے گی لیکن کچھ اس انداز سے کہ کہتے ہیں بنتی ہے ع

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پونے دس بجے بستر سے اٹھے، دس بجے کالج پہنچنا ہے۔ اس پندرہ منٹ کے مختصر وقفہ میں کیا کچھ کرنا ہے۔ ڈاڑھی مونڈنا، منہ ہاتھ دھونا، اخبار کی سرخیوں پر نظر دوڑانا۔ دس بارہ مشکل الفاظ کے معنی لغات میں دیکھنا، ناشتا کرنا، کپڑے پہننا۔ ظاہر ہے یہ تمام کام پندرہ منٹ میں نہیں کیے جاسکتے جب تک انہیں بیک وقت نہ کیا جائے۔ چنانچہ ایک ہاتھ سے منہ میں لقمہ ڈال

رہے ہیں، دوسرے سے لغات کی ورق گردانی کر رہے ہیں۔ لقمہ منہ میں پہنچ جاتا ہے تو خالی ہاتھ جراب پہنانے میں مشغول ہو جاتا ہے، بایاں ہاتھ بالوں میں کنگھی کر رہا ہے اور دایاں ٹائی کی گرہ لگا رہا ہے۔ کسی نہ کسی طرح تیاری کا مرحلہ ختم ہوا۔ اب سڑک پر ہیں۔ تیز تیز قدم اٹھا رہے ہیں لیکن آوازوں کا ہجوم ہے کہ تعاقب کر رہا ہے۔

''پروفیسر صاحب۔ میرا لڑکا''..... ''جی ہاں میں اس کے نمبر بڑھا دوں گا''۔

''پروفیسر صاحب۔ میری لڑکی''..... ''جی ہاں۔ وہ پاس ہو جائے گی''۔

''پروفیسر صاحب میرا بل''..... ''جی ہاں یکم کو ادا کر دوں گا''۔

ہانپتے کانپتے کمرے میں پہنچے۔ وہ شور ہے کہ کان کے پردے پھٹے جا رہے ہیں۔ گرج کر دو تین بار ''خاموش'' کا نعرہ بلند کرتے ہیں لیکن آواز صدا بصحرا بن کر وہ جاتی ہے۔ الٰہی یہ کمرا ہے یا نقار خانہ۔ آخر تنگ آ کر میز پر زور سے مکے مارنا شروع کر دیتے ہیں۔ ''حضرات! خاموش۔ آخر ایسی بدتمیزی بھی کیا۔ جب ہم طالب علم تھے تو اس قسم کی بداخلاقی کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے۔ جگل کشور تم میری درخواست کے باوجود شور مچا رہے ہو۔ نکل جاؤ، کمرے سے باہر''۔

یک لخت کمرے میں سناٹا چھا جاتا ہے۔ پچھلے بنچ سے ایک لڑکا سیٹی بجاتا ہے۔ ساری جماعت کھل کھلا کر ہنس پڑتی ہے۔

''کون ہے یہ بدتمیز۔ ضرور جے کشن ہوگا۔ جے کشن فوراً کمرے سے باہر نکل جاؤ''۔ چند سیکنڈ خاموشی۔ تیسرے بنچ پر ایک لڑکا سرگوشی کے انداز میں اپنے ہمسائے سے کہتا ہے۔ ''معلوم ہوتا ہے۔ آج بیوی سے لڑائی ہوئی ہے''۔ پھبتی سن کر خون کھولنے لگتا ہے۔ لیکن دانت پیس کر رہ جاتے ہیں۔ اب حاضری لی جا رہی ہے۔ خدا خدا کر کے شور غل کے درمیان حاضری ختم ہوئی۔ رجسٹر سے نگاہیں اٹھیں۔

'ارے یہ کیا۔ آدھی سے زیادہ جماعت غائب ہو چکی ہے۔ اچھا ہم دوبارہ حاضری لیتے ہیں۔ اب ایک ایک کر کے بھاگنے والے مختلف دروازوں اور کھڑکیوں سے داخل ہو رہے ہیں''۔

''تم کہاں تھے نندلال؟''۔

''جی سائیکل کو تالا لگانے گیا تھا''۔

''اور تم روی شنکر''۔

''جی ذرا آب وہوا تبدیل کرنے کے لیے باہر گیا تھا''۔

''تم دونوں بکتے ہو۔ میں تمہیں پانچ پانچ روپے جرمانہ کرتا ہوں''۔

''حضرات! اب کتابیں کھولیے۔ آج کا سبق نہایت اہم ہے۔ یہ ایک نظم ہے۔ جسے ملٹن نے لکھا ہے۔ ملٹن انگلستان کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ شاعری میں اس کا جواب نہیں۔ ملٹن کے متعلق ایک نقاد لکھتا ہے کہ''.....

''میاؤں، میاؤں''۔

ساری جماعت قہقہہ لگا کر ہنستی ہے۔ ''کون ہے یہ نامعقول، حضرت میں ایسی حرکات سخت ناپسند کرتا ہوں..... ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ وہ نقاد لکھتا ہے کہ ملٹن انگلستان کا سب سے بڑا زاہد تھا''۔

ایک آواز: ''سنا ہے۔ اس نے تین شادیاں کی تھیں۔''

(قہقہہ)

''ملٹن اس نظم میں شکایت کرتا ہے کہ خدا نے اسے شاعری کا ملکہ عطا کرنے کے بعد آنکھوں سے محروم کیوں کیا''۔

ایک آواز: ''شاید خدا اسے سزا دینا چاہتا تھا۔''

''کس جرم کی؟''۔

''غیر دلچسپ نظمیں لکھنے کی''۔

''خاموش! اتنے بڑے شاعر کی توہین کرتے شرم نہیں آتی''۔

''تمہید ختم ہوئی۔ اب نظم کی طرف آیئے''۔

''جی، نظم کل پڑھایئے گا۔ ہم تھک گئے ہیں''۔

''بہت نازک مزاج ہیں آپ۔ ابھی تو گھنٹی بجے دس منٹ بھی نہیں ہوئے''۔

''جی، باقی وقت میں باتیں کریں گے''۔

''کیسی باتیں''۔

''وصلِ یار کی''۔

''جی اپنا کوئی معاشقہ سنایئے''۔

''خاموش''۔

''جی کوئی شعر سنایئے''۔

''جی آپ نے ''چلبلی معشوقہ'' دیکھی؟''

''میں ایسی بیہودہ فلمیں نہیں دیکھتا''۔

''اچھا جی۔ تو پھر چھٹی ہی دے دیجئے''۔

''چھٹی۔ اگر پرنسپل صاحب کو پتا چل گیا تو''۔

''جی پرنسپل صاحب تو خود چھٹی پر ہیں''۔

''اچھا تم جا سکتے ہو''۔

چیخوں، قہقہوں، نعروں کے درمیان جماعت باہر چلی جاتی ہے۔ ابھی دوسری گھنٹی میں بیس منٹ باقی ہیں۔ یہ وقت سٹاف روم میں گزارا جاتا ہے جہاں گپ شپ اڑتی ہے۔ باتیں بنانے کے علاوہ ایک دوسرے کو بنایا جاتا ہے۔

''آیئے پروفیسر صاحب، بہت دبلے ہو رہے ہیں۔ آج کل ٹیوشنز کا زور ہے۔ کچھ سنا بھئی۔ مجھے اس سال بھی ترقی نہیں ملے گی''۔ ''تمہارے پاس یار بدھیمی کا نسخہ تھا۔ مجھے پرسوں سے کھٹے ڈکار آ رہے ہیں''۔ وہ پڑھی آپ نے لاسکی کی نئی کتاب۔ خوب لکھتا ہے ظالم''۔ ''یار ''پرچوں'' نے بہت تنگ کر رکھا ہے۔ کم بخت ختم ہونے میں نہیں آتے''۔ ''سنا ہے تم پر پرنسپل صاحب بہت مہربان ہیں۔ کل مسکرا کر بات کر رہے تھے''۔ ''یار یہ پتلون تو دھلوا لو۔ بہت میلی ہو رہی ہے''۔ ''سنا آپ نے پروفیسر رام گوپال کو دق ہو گئی ہے''۔

دوسری گھنٹی بجتی ہے۔ سب پروفیسر رجسٹر اٹھائے سر جھکائے اپنے اپنے کمروں کو چل دیتے ہیں۔ اب مجھے سیکنڈ ایر کو پڑھانا ہے۔ یہ جماعت پہلی جماعت سے کہیں زیادہ شریر ہے۔ حاضری لینے کے لیے رجسٹر کھولتے ہیں۔ لیکن طلبہ ہیں کہ بے تحاشا ہنستے جا رہے ہیں۔ بات کیا ہے۔ یہ بار بار تختۂ سیاہ کی طرف کیوں دیکھتے ہیں۔ یک لخت تختۂ سیاہ کی طرف نگاہ دوڑاتے ہیں۔ اپنا کارٹون دیکھ کر جھینپ کر رہ جاتے ہیں اور خفت چھپانے کے لیے جلدی سے حاضری لینے لگتے ہیں۔

''لیش پال''۔

تمام جماعت بیک آواز پکارتی ہے۔''یس سر''۔

''اوم پرکاش''۔

ایک لڑکا پوری طاقت سے چلا کر کہتا ہے''نو سر''۔

''دینا ناتھ''۔

ایک آواز:''جے ہند''۔

دوسری آواز:''بندے ماترم''۔

تمام جماعت:''ست سری اکال''۔

جھٹ رجسٹر بند کر دیتے ہیں اور لال لال آنکھیں دکھا کر تقریر کرنے لگتے ہیں۔

''حضرات! آپ کو شرم آنی چاہئے۔ مجلسی آداب آپ کو چھو تک نہیں گئے۔ آپ ''آزادی، آزادی'' کی رٹ لگاتے ہیں۔ کیا اس منہ سے آزادی لیں گے۔ آزادی اور ڈسپلن لازم وملزوم ہیں۔ انگریزوں کی طرف دیکھئے، روسیوں کی طرف دیکھئے۔ میں کہتا ہوں جاپانیوں کی طرف.....''۔

ایک آواز:''قومی نعرہ''۔

ساری جماعت:''انقلاب زندہ باد''۔

''حضرات! اگر آپ انقلاب لانا چاہتے ہیں تو پہلے اپنے آپ میں لائیے''۔

ایک آواز:''آپ بھی ٹائی اتار دیجئے''۔

(قہقہہ)

''اچھا۔ کتابیں نکالئے۔ آج میں آپ کو انگلستان کے مشہور شاعر جان کیٹس کے حالاتِ زندگی بتاؤں گا۔ (کیٹس کے متعلق نہایت عالمانہ تقریر کرتے ہیں) لیکن لڑکے بدستور سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ کچھ جمائیاں لے رہے ہیں۔ چند ایک مزے سے چلغوزے کھا رہے ہیں۔ باقی بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

''حضرات! بیس برس کی عمر میں کیٹس کو ایک لڑکی سے عشق ہو گیا''۔

عشق کا ذکر سنتے ہی ساری جماعت چوکنی ہو جاتی ہے۔''اس لڑکی کا نام فینی بران تھا۔

کیٹس نے اسے چند خطوط لکھے''۔

ایک آواز: اجی وہ خطوط ہمیں بھی سنایئے''۔

دوسری آواز: ''کہ بوقت ضرورت کام آئیں''۔

طلبہ کے اصرار پر کیٹس کا ایک خط پڑھ کر سناتے ہیں۔

آوازیں: ہائے کیا جلا پھنکا خط ہے''۔

''ظالم نے مار ڈالا''۔

''عشق نے غالب نکما کر دیا''۔

''ہائے فینی بران''۔

گھنٹی بجتی ہے۔ لڑکے ''جان کیٹس زندہ باد'' کے نعرے لگاتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔

اسی انداز سے باقی تین پیریڈ پڑھا کر چار بجے گھر لوٹتے ہیں۔ دماغ تھک کر چور ہو چکا ہے۔ جی چاہتا ہے تھوڑی دیر سو جائیں۔ یک لخت کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔

''پروفیسر صاحب! مجھے ایک سرٹیفکیٹ چاہیے''۔

جی کڑا کر کے سرٹیفکیٹ لکھ دیتے ہیں۔ دروازہ بند کر کے لیٹنے کی تیاری کرتے ہیں۔

کھٹ کھٹ کھٹ

''کون ہے''۔

''جی میں ہوں رام گوپال''۔

دروازہ کھولتے ہیں۔ رام گوپال گڑگڑا کر کہتا ہے۔ ''پروفیسر صاحب!

خدا کے لیے میرا جرمانہ معاف کر دیجئے، ورنہ میرا باپ مجھے گھر سے نکال دے گا''۔

ایک طویل تکرار کے بعد جرمانہ معاف کر دیتے ہیں۔

کھٹ کھٹ کھٹ

پھر دروازہ کھولتے ہیں۔ ایک لڑکا سہما اور گھبرایا ہوا ہاتھ میں انگریزی کا پرچہ تھامے ہوئے نظر آتا ہے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ پکار کر کہتا ہے۔

''پروفیسر صاحب! مجھے پانچ نمبر اور دے دیجئے ورنہ میں تباہ ہو جاؤں گا''۔

دو گھنٹے اس بات پر بحث ہوتی رہی کہ امتحان میں اس کی ناکامیابی کی ذمہ داری ہم پر عائد

ہوتی ہے یا اس پر۔ دماغ پہلے سے بھی زیادہ تھک جاتا ہے۔ غشی کی حالت طاری ہوا چاہتی ہے کہ کالج کا چپڑاسی دروازے پر دستک دیتا ہے۔

''جناب آپ کو پرنسپل صاحب یاد فرماتے ہیں''۔

پرنسپل صاحب سے ملاقات ہوتی ہے۔ وہ کوئی نئی بات نہیں سناتے۔ وہی پرانے شکوے۔ ''آپ روزانہ لیٹ کیوں آتے ہیں؟ آپ کی جماعت اتنا شور کیوں مچاتی ہے۔ آپ نے کل پانچواں پیریڈ کیوں نہیں لیا؟ آپ کھیلوں میں حصہ کیوں نہیں لیتے؟ یونیورسٹی کے امتحان میں آپ کی جماعت کا نتیجہ ہر سال کیوں ''خراب'' رہتا ہے؟''

الغرض ایسی باتیں جنہیں سن کر کلیجہ چھلنی ہو جاتا ہے۔ ہم زیر لب ایک شعر گنگناتے ہیں

چپ رہے ہم ادب سے محشر میں
ورنہ کس بات کا جواب نہ تھا

اور مجرموں کی طرح سر جھکائے کمرے سے باہر چلے جاتے ہیں

گزرنے کو تو عمر گزر رہی ہے اور گزر جائے گی۔ لیکن اس انداز سے کہ کہتے ہی بنتی ہے ہم بھی کیا یاد کریں گے خدا رکھتے ہیں۔

☆☆☆

خودکشی

آخر اس نے خودکشی کر لی۔ کیا اسے کسی سے عشق تھا؟ کیا وہ گھوڑ دوڑ میں روپیہ ہار گیا تھا؟ کیا وہ مقروض تھا۔ اسے صرف زکام کی شکایت تھی! بس اتنی سی بات پر! اتنا بزدل!

نہیں صاحب وہ بزدل نہیں تھا۔ جو شخص متواتر پندرہ دن سولف کا جوشاندہ پی سکتا ہے، ایک ماہ بنفشہ کا شربت زہر مار کر سکتا ہے، ڈیڑھ ماہ عناب، بنفشہ اور ادرک کی چٹنی کھا سکتا ہے۔ وہ وہ کٹوریہ کراس کا مستحق ہو نہ ہو، بزدل نہیں ہو سکتا۔ بات دراصل یہ تھی کہ اسے صبح و شام اس شدت سے چھینکیں آتی تھیں کہ وہ چھینکتے چھینکتے بدحواس ہو جاتا۔ اس نے دوستوں سے اپنی تکلیف کا ذکر کیا۔ وہ الٹا اسے بنانے لگے۔ ''ارے میاں! یہ بھی کوئی مرض ہے۔ کالی کھانسی نہ تپ دق، محض زکام''۔ جب اس نے اصرار کیا کہ زکام اتنا ہی اذیت بخش مرض ہے،

جتنا کہ تپ محرقہ تو کسی دوست نے کہا۔ ''فاقہ کرو۔ کوئی بولا پیٹ بھر کر کھاؤ''۔ کسی نے مشورہ دیا۔ ''ٹھنڈے پانی سے غسل کرو''۔ کسی نے بتایا۔ ''گرم حمام میں نہاؤ''۔ کسی نے بتایا۔ ''کھلی ہوا میں زور زور سے سانس لو''۔ کسی نے سمجھایا ''بند کمرے میں آنکھیں بند کر کے لیٹ جاؤ''۔ اس نے ہر ایک دوست کے مشورہ پر عمل کیا۔ لیکن کچھ افاقہ نہ ہوا۔ اب اس نے ویدوں اور حکیموں کی دکانوں کا رخ کیا اور شربتِ عناب سے لے کر گندھک تیزاب تک ہر ایک رقیق شے کو پی لیا۔ لیکن اسے زکام سے نجات نہ ملی۔ تنگ آ کر اس نے ڈاکٹروں سے رجوع کیا۔ ایک ڈاکٹر نے تشخیص کی کہ اس کی ناک میں نقص ہے۔ دوسرے نے کہا۔ ''اس کے گلے میں خراش ہے''۔ تیسرے نے بتایا ''اس کے بائیں پھیپھڑے میں ورم ہے''۔ چوتھے نے کہا۔ ''دائیں میں سوزش ہے''۔ پانچویں نے کہا ''دونوں پھیپھڑے گل چکے ہیں''۔ چھٹے نے ایک ایسے مرض کا نام بتایا جو تین سطروں میں بمشکل لکھا جا سکتا تھا۔ اس نے ناک کا اپریشن کرایا، گلے میں دوا چھڑکوائی، پھیپھڑوں کو تقویت دینے کے لیے مچھلی کا تیل پیا۔ لیکن اسے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ایک تجربہ کار ڈاکٹر کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے اس نے گلے کا اپریشن کرایا۔ چونے کے انجکشن لیے، چھ ماہ ہسپتال میں رہا۔ لیکن اسے بدستور چھینکیں آتی رہیں۔ جب وہ اپنا سارا اثاثہ ڈاکٹروں کی نذر کر چکا تو اسے بتایا گیا کہ اسے اس لیے چھینکیں آتی ہیں کہ اس کی ناک میں لمبے لمبے بال ہیں۔ اس اطلاع سے اسے اتنا صدمہ پہنچا کہ اس نے خودکشی کر لی.....

اس نے خودکشی کر لی۔ آخر کیوں؟ کیا اس کی بیوی بدصورت تھی؟ کیا وہ دائم المریض تھا؟ کیا اس کا دیوالیہ پٹ گیا تھا؟ نہیں تو پھر؟ کیوں کہ وہ جونکوں سے ڈرتا تھا۔ جونکوں سے؟ بہت بزدل نکلا۔ نہیں صاحب وہ بزدل نہیں تھا۔ غیر معمولی جرات کا مالک تھا۔ پھر اس نے خودکشی کیوں کی؟ کیونکہ یہ جونکیں بھی غیر معمولی تھیں۔ یہ وہ جونکیں تھیں جو جوہڑوں اور تالابوں میں رہنے کے بجائے مٹی کے گھروندوں میں رہتی ہیں۔ مثلاً ایک جونک تھی جسے وہم ہو گیا تھا کہ اگر کوئی شخص اس کی مدد کرے تو وہ ناول لکھ سکتی ہے۔ یہ جونک ہر تیسرے دن اس کے دماغ سے چپک جاتی ہے اور جب تک نس نس کا خون چوس نہ لیتی علیحدہ نہ ہوتی۔ اس جونک کا مطالبہ تھا کہ اسے پہلے ناول لکھنے کا ڈھنگ بتایا جائے، پھر کردار سازی کا طریقہ سمجھایا جائے، ناول کا پلاٹ مہیا کیا جائے، کردار بہم پہنچائے جائیں اور اگر ہو سکے تو ناول لکھ کر اس کے سپرد کیا جائے۔ ایک

جونک تھی جسے باتیں بنانے کا شوق تھا۔ یہ جونک ہر چیز اور ہر مسئلہ کو تین قسموں میں منقسم کرتی اور انہیں شمار کرتے وقت ایک قسم ہمیشہ بھول جاتی۔ مثلاً انسان تین طرح کے ہوتے ہیں۔ زندہ دل اور مردہ دل اور تیسری قسم میں پھر بھول گیا۔ دوست تین اقسام کے ہوتے ہیں۔ فرشتہ مسرت اور ابلیس نما، اور تیسری قسم میں پھر بھول گیا۔ عورتیں تین قسم کی ہوتی ہیں۔ بامذاق اور بد دماغ اور..... خیر تیسری قسم میں پھر بتاؤں گا۔ ایک وہ جونک تھی جو ہر بات کا آغاز ''کاش یوں ہوتا'' سے کرتی تھی۔ ''کاش میری زندگی میں کوئی خوبصورت عورت ہوتی'' کاش میرے کپڑے پھٹے پرانے نہ ہوتے''۔ ''کاش میری بیوی ذہین ہوتی''۔ ''کاش میری لڑکی ہر سال امتحان میں فیل نہ ہوتی''۔ ''کاش مجھے بواسیر کی شکایت نہ ہوتی''۔ ایک جونک جونک اس سے روپیہ کمانے کی تجویز پوچھنے آتی تھی۔ ''بسکٹ بنانے کی بھٹی لگا لگا لوں؟ چڑیاں اور طوطے بیچنا شروع کر دوں؟ جوتے گانٹھنے کا کام کیسا رہے گا؟ سرمایہ کتنا درکار ہوگا؟ دکان کیسے ملے گی؟ آپ کتنا روپیہ قرض دے سکیں گے؟'' اسی طرح ایک جونک تھی جسے اخبارات میں شکائتی خطوط چھپوانے کا مرض تھا۔ اس جونک سے اس کا تب تک چھٹکارا نہ ہوتا جب تک وہ اسے شکائتی خط کا مضمون تیار کر کے نہ دیتا۔ ''آج میونسپلٹی کے خلاف خط لکھ دیجئے۔ آج یونیورسٹی والوں کو ڈانٹ بتائیے۔ آج لوگوں کی توجہ بنگال کے قحط کی طرف مبذول کرائیے۔ آج فلاں سڑک کی مرمت کے متعلق کارپوریشن کو کھری کھری سنائیے۔ آج بھنگیوں کی ہڑتال کے بارے میں کچھ لکھ ماریئے۔ آج جہیز کی رسم کے خلاف جہاد کیجئے۔ آج فلاں افسر کا پول کھول کر رکھ دیجئے''۔

متواتر پندرہ سال یہ جونکیں اس کا خون چوستی ہیں۔ اس نے ان سے پیچھا چھڑانے کے لیے ہزاروں حیلے بہانے کیے لیکن بے سود۔ آخر تنگ آ کر اس نے یکم جنوری 1946ء کو خود کشی کر لی۔

اس نے خودکشی کر لی، کیا اسے زکام تھا؟ کیا جونکوں سے ڈرتا تھا؟ نہیں؟ اس نے صرف شادی کی تھی۔ بس اتنی سی بات پر! ہاں صاحب لیکن دراصل یہ ''اتنی سی بات'' نہ تھی۔ اس کی شادی کے چند ماہ بعد اس کا سسر، اس کی ساس، اس کی بڑی سالی اس کے دو سالے، غرضیکہ

اس کا سارا سسرال اس کے ہاں چلا آیا۔ اس کا سسر پرانے خیالات کا آدمی تھا۔ اور ''دخل درمعقولات'' کا قائل۔ وہ اپنے داماد کی ہر بات میں ٹانگ اڑانا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ ''دیکھو میاں! فلاں تمہارا دوست مجھے اول درجے کا کمینہ نظر آتا ہے، اسے منہ نہ لگاؤ۔ دیکھو صاحبزادے بیوی سے کبھی گستاخی سے مت پیش آؤ۔ نقصان اٹھاؤ گے''۔ ''دیکھو عزیز کھانا چبا چبا کر کھاؤ، ورنہ بدہضمی میں مبتلا ہو جاؤ گے''۔ ''دیکھو شریف زادے میری ہر بات پر عمل کرو ورنہ تباہ ہو جاؤ گے''۔

اس کی ساس کا صرف ایک شغل تھا۔ اپنی بیٹی کی ہر بات میں حمایت کرنا۔ ''میری زبیدہ بچپن سے لاڈلی ہے۔ نوکر چاکر کیا وہ تو ماں باپ پر حکومت کرنے کے عادی ہے۔ میری زبیدہ ایک دفعہ ''نہ'' کرنے کے بعد کبھی ہاں نہیں کرتی، چاہے کوئی مایوس ہو کر زہر کیوں نہ کھالے۔ میری زبیدہ جب روپیہ خرچ کرتی ہے تو بخل سے کام نہیں لیتی۔ چاہے روپیہ کمانے والے کا دیوالیہ پٹ جائے''۔ ''میری زبیدہ جب جلال میں آتی ہے تو حریف کو ناکوں چنے چبوا دیتی ہے''۔

اس کے دونوں سالے بیکار تھے۔ جنہیں ڈنٹر پیلنے۔ پیٹ بھر کر کھانے اور اس کے بہترین سگرٹ چرانے کے علاوہ کوئی کام نہیں تھا۔

اس کی سالی چوبیس گھنٹے اپنے مرحوم خاوند کو کوستی رہتی۔ ''میں نے سو بار سمجھایا اتنی شراب مت پیا کرو لیکن وہ تو مرنے پر تلا ہوا تھا۔ میں کہتی ہوں اگر وہ احمق نہ ہوتا تو ساری جائیداد جوئے میں کیوں ہارتا۔ میرا تو اس دن نصیب پھوٹ گیا، جب احمد کی بجائے اس سے میری سگائی ہوئی''۔ اس کی سالی کا لڑکا وقت بے وقت اس کی گود میں آ بیٹھتا، کبھی اس کی عینک کا شیشہ توڑ ڈالتا، کبھی اس کے قلم کی نب مروڑ دیتا، کبھی اس کے نئے سوٹ پر سیاہی کی بوتل انڈیل دیتا اور اس کی ماں بدتمیزی سے مسکرانے یا ہنسنے لگتی۔

متوتر تین سال وہ خدا سے دعا مانگتا رہا کہ اسے ان بن بلائے کے مہمانوں سے چھٹکارا دلائے لیکن اس کی ایک بھی دعا کارگر نہ ہوئی۔ جب اس کے صبر کا پیالہ لبریز ہو گیا تو اس نے ایک دن نہایت شرافت سے راوی میں ڈوب کر خودکشی کر لی۔

☆☆☆

بے تکلفی

کہنے کو تو استاد ذوق فرما گئے ع

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر

لیکن یہ غور نہ فرمایا کہ اگر تکلف ہے تو بے تکلفی میں کون سی راحت ہے۔ تجربہ شاہد ہے۔ کہ تکلف، وہ تکلف بھی جس کی معراج ''پہلے آپ'' ہے، بے تکلفی سے بدرجہا اچھا ہے، فرض کیجئے آپ جہنم کے دروازے پر کھڑے ہیں اور جہنم کا داروغہ آپ سے کہتا ہے۔ ''تشریف لے چلئے''۔ اور آپ مسکرا کر نہایت لجاجت سے عرض کرتے ہیں۔ ''اجی پہلے آپ''۔ تو عین ممکن ہے کہ آپ کے حسن اخلاق سے مرعوب ہو کر آپ کو جہنم کی بجائے جنت میں بھجوا دے۔ اس کے برعکس اگر آپ کی داروغہ جنت بے تکلفی ہے تو ہو سکتا ہے کہ ہنسی مذاق میں وہ آپ کو باغ بہشت کی کسی نہر میں اتنے غوطے دلوائے کہ آپ کو چھٹی کا دودھ یاد آ جائے۔

تکلف کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہینگ لگتی ہے نہ پھٹکڑی اور ظاہر داری جوں کی توں قائم رہتی ہے۔ مثلاً آپ کے گھر کوئی صاحب تشریف لاتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں۔ ''کچھ منگواؤں آپ کے لئے''۔ وہ فرماتے ہیں۔ ''اجی صاحب تکلف مت کیجئے۔''

''چائے پئیں گے؟''

''شکریہ! ابھی پی ہے''

''سوڈا منگواؤں''۔

''نہیں صاحب آپ تو خواہ مخواہ تکلف کرتے ہیں''۔

''شربت پیجئے گا''۔

''واہ صاحب آپ تو پھر تکلف پر اتر آئے''۔

''ٹھنڈا پانی پیجئے''۔

''اچھا صاحب، اگر آپ اصرار کرتے ہیں تو پی لیں گے''۔

اب اگر انہی حضرت سے آپ کی بے تکلفی ہو، تو آپ کو کتنی زحمت اٹھانی پڑے۔

''کھانا کھائیں گے آپ؟''۔

''ہاں ہاں ضرور کھائیں گے لیکن کھانا کھانے سے پہلے چائے پئیں گے''۔

''چائے منگواؤں''۔

''ضرور منگوایئے لیکن پہلے سگریٹ پلایئے''۔

''چائے کے ساتھ کیا کھایئے گا''۔

''اماں یار تمہیں معلوم ہے، پاؤ بھر گاجر کا حلوہ، دو آملیٹ، چار ٹوسٹ، اور چھ سنبوسے، دس بارہ کریم رول، اور ہاں ایک آدھ کیک ہو جائے تو بحان اللہ۔ لیکن جلدی کیجئے''۔

بے تکلفی میں یوں تو ہزاروں قباحتیں ہیں، لیکن سب سے بڑی یہ کہ بسا اوقات اس کے طفیل آپ کو سخت خفت اٹھانا پڑتی ہے۔ آپ چند معزز اشخاص سے نہایت عالمانہ انداز میں کسی مسئلہ پر گفتگو کر رہے ہیں کہ کوئی صاحب دروازے پر اس طرح دستک دیتے ہیں گویا دروازہ توڑ کر ہی دم لیں گے۔ دو ایک منٹ دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد بلند آواز میں چلّانا شروع کر دیتے ہیں۔ ''ابے حسین! کہاں ہے تو، دروازہ کھول۔ ابے نا ہنجار۔ سنتا نہیں، ہم کب سے چلّا رہے ہیں۔ ارے کوئی ہے۔ سب مر گئے کیا''۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ آپ کے احباب پر نگاہ غلط انداز ڈالتے ہیں اور نہایت متانت سے کہتے ہیں۔ ''معاف کیجئے گا صاحب۔ میری ان سے ذرا بے تکلفی ہے''۔

یا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ دو بے تکلف دوستوں کے درمیان کچھ اس طرح گھر جاتے ہیں کہ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ ان میں سے ایک دوسرے کو نہایت غلیظ گالی دیتا ہے۔ اور آپ کی طرف عفو طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہتا ہے۔ ''معاف کیجئے گا۔ ہم بہت دنوں کے بعد ملے ہیں''۔ اس معذرت کے بعد گالیوں کا وہ سلسلہ شروع ہوتا ہے کہ آپ کو بے ساختہ اس بے تکلفی کی داد دینا پڑتی ہے۔

ناولوں میں بے تکلف دوستوں کی بڑی دلچسپ مثالیں ملتی ہیں۔ تھیکرے ایک کردار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ صاحب جس دوست کے پاس ٹھہرتے تھے، رخصت ہوتے وقت اس سے ایک قمیص ضرور مستعار لیا کرتے تھے۔ ہمارے ایک دوست اس معاملے میں تھیکرے کے اس کردار سے بازی لے گئے ہیں۔ وہ صرف قمیص اکتفا نہیں کرتے بلکہ ساری پوشاک کا مطالبہ کرتے ہیں۔ عموماً ٹیکسی میں سوار ہو کر ہمارے ہاں تشریف لاتے ہیں اور

کمرے میں داخل ہوتے ہی فرماتے ہیں۔ پانچ روپے کا ایک نوٹ نکالیے، ڈرائیور کو دفع کرلوں، پھر باتیں کریں گے''۔ یہ حضرت ہمیشہ ہماری عدم موجودگی میں واپسی کا عزم کرتے ہیں اور وداع ہوتے وقت نوکر سے کہہ جاتے ہیں۔ وہ آئیں تو انہیں کہہ دیجئے گا کہ میں ان کا گرم کوٹ، خاکی ٹائی اور کالی پتلون ساتھ لے جارہا ہوں۔ چند دن استعمال کر کے واپس کردوں گا''۔

ہمارے ایک اور بے تکلف دوست ہیں۔ وہ جہاں کہیں ہم سے ملتے ہیں، مصافحہ کرنے کے بجائے بار بار بغلگیر ہو کر بے تکلفی کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک بار انارکلی میں ملاقات ہوئی۔ بازار کے بیچ انہوں نے یہ عمل جو دہرانا شروع کیا تو راہ گیر دانتوں میں انگلیاں داب کر رہ گئے۔ ہر دو منٹ کے بعد بغلگیر ہو کر کہتے۔ ''بھئی خوب ملے۔ یار حد ہوگئی''۔ وہ اس انداز سے مجھے اپنے بازوؤں کے شکنجے میں کس رہے تھے، گویا برسوں کے بعد ملے ہیں۔ حالانکہ اس ملاقات سے صرف دو دن پہلے مال روڈ پر ملے تھے اور وہاں بھی انہوں نے اسی قسم کی گرمجوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔

بے تکلف دوست کی تو وہی مثال ہے کہ اسے وبالِ جان سمجھتے ہوئے بھی آپ وبالِ جان نہیں کہہ سکتے۔ اگر اس کے جی میں آئے، تو آدھی رات کو آپ کے گھر آدھمکے اور نہ صرف لذیذ کھانے کا مطالبہ کرے بلکہ کہے کہ ''سوئیں گے بھی آپ کے ساتھ''۔ دوپہر کے وقت آپ سو رہے ہوں، تو قینچی لے کر از راہ مذاق آپ کی دونوں مونچھوں کا صفایا کر ڈالے۔ شدت درد سے آپ کراہ رہے ہوں تو بدتمیزی سے آپ کا منہ چڑانا شروع کر دے، آپ مضمون لکھ رہے ہوں تو آپ کے ہاتھ سے مضمون چھین کر آتش دان میں پھینک دے۔

بعض اوقات بے تکلف احباب ایسی حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں۔ کہ آپ بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں۔ ''ہائے تکلف! ہائے تکلف!!'' ایک دفعہ مجھے دہلی جانا تھا۔ گاڑی کے آنے میں دیر تھی۔ پلیٹ فارم پر ٹہل رہا تھا۔ اتنے میں ایک دوست سے ملاقات ہوگئی۔ پوچھنے لگے ''کہاں جارہے ہو؟'' میں نے کہا ''دہلی'' کہنے لگے۔ ''دہلی جا کر کیا کرو گے چلو باٹا نگر چلیں''۔ میں نے معذرت چاہی۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ یک لخت انہوں نے کہا۔ ''ذرا ٹکٹ دکھایئے تو''۔ میں نے ٹکٹ دکھایا ٹکٹ لے کر انہوں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور قلی سے کہنے لگے۔ ''صاحب کا سامان واپس لے چلو۔ انہوں نے دہلی جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے''۔

انہی صاحب نے ایک بار اس سے بھی عجیب حرکت کی۔ ایک دن میں دریا کے کنارے کھڑا ہو کر غروب آفتاب کا منظر دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے آپ کہاں سے آ ٹپکے۔ آپ نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ پیچھے سے مجھے اس زور سے دھکا دیا کہ میں لڑکھڑاتا ہوا پانی میں جا گرا۔ آپ نہایت ڈھٹائی سے قہقہہ لگا کر فرمانے لگے۔ ''واہ خوب چھلانگ لگائی آپ نے''۔ جب میں بڑی مشکل سے تیر کر کنارے کے قریب پہنچا تو ایک قہقہہ لگا کر کہنے لگے۔ ''مجھے معلوم نہ تھا، آپ اتنے اچھے تیراک بھی ہیں''۔

تکلف کے خلاف آپ جو چاہیں کہیں، لیکن آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ تکلف سراسر نفاست ہے اور بے تکلفی سراسر کثافت۔ تکلف ''پہلے آپ'' ہے تو بے تکلفی ''پہلے ہم اور جہنم میں جائیں آپ'' ہے۔ تکلف گز بھر لمبا گھونگھٹ ہے تو بے تکلفی گز بھر لمبی زبان۔ تکلف زیر لب مسکراہٹ ہے تو بے تکلفی خندہ بیباک۔

اب اگر اس پر بھی استاد ذوق فرمائیں کہ ''تکلف میں سراسر تکلیف ہے'' تو ہم تو یہی کہیں گے کہ ''صاحب آپ کو بے تکلف دوستوں سے پالا ہی نہیں پڑا!''

☆☆☆

فریادی

''مجموعۂ اضداد ہے! راز سربستہ ہے! سوفی صدی پرولتاری ہے، دوسوفی صدی بورژوا ہے، سوالیہ نشان ہے؟ المیہ نظم ہے، سراسر رومانی ہے، یکسر قنوطی ہے، نوحۂ کشمیر ہے! نالۂ یتیم ہے!! لارنس عربی کے بعد دوسرا پراسرار شخص ہے۔ آزاد اور ظفر علی خاں کے بعد تیسرا خطیب ہے''..... یہ ہیں مختلف رائیں جن کا کرشن چندر کی شخصیت کے متعلق اظہار کیا گیا ہے، حتیٰ کہ بیچارہ کرشن چندر، ابوالہول کی پہیلی بن کر رہ گیا ہے۔ میری دانست میں کرشن چندر سیدھا سادا انسان ہے۔ اس کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ اسے ہر خوبصورت عورت اپنا ''بھائی'' اور ہر بدصورت لڑکی اپنا ''عاشق'' تصور کر لیتی ہے۔ مجموعۂ اضداد وہ صرف اس حد تک ہے کہ اس کی آنکھیں کشمیری، زبان پنجابی، اور لباس یورپین ہے اور طبعاً، عملاً وہ بورژوا لیکن قولاً و تحریراً پرولتاری ہے۔ البتہ ایک اعتبار سے وہ عجیب و غریب ادیب ہے۔ نومبر 1939ء کا ذکر ہے کہ

لاہور میں اچانک اس نے خودکشی کر لیلیکن ایک ماہ بعد دہلی میں زندہ ہو گیا۔ 1942ء میں لکھنؤ میں اس کی دوسری وفات ہوئی لیکن عدم آباد پہنچنے کی بجائے پونا پہنچ گیا۔ اس وقت بمبئی میں ہے۔ اور ابھی تک زندہ ہے۔ شاید اب کبھی نہیں مرے گا۔

فطرتاً وہ تلون کیش ہے۔ ہر تیسرے سال کے بعد ایک نئے امام کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے۔ لڑکپن میں اس کا امام ڈان جوآن تھا، جوانی میں احمد شاہ بخاری، چند دنوں کے لیے ڈبلیو زید احمد پر ایمان لے آیا، اور آج کل اس کا امام دیوکا رانی ہے۔ ایک ہی قسم کے قدرتی نظاروں، نسوانی جمالوں اور ادبی تجربوں سے وہ دیر تک مطمئن نہیں رہ سکتا۔ سرینگر سے پہلگام جاتے ہوئے کشمیری جھرنوں، برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں اور گنگناتے ہوئے پہاڑی نالوں سے متاثر ضرور ہوتا ہے لیکن جلد ہی ان سب کا مذاق اڑانے لگتا ہے۔ ''ہم بھی کتنے بے وقوف ہیں''۔ وہ لاری میں بیٹھے ہوئے کہتا ہے کہ ان آبشاروں کے مسلسل اور بے معنی شور میں موسیقی تلاش کر رہے ہیں۔ پہلگام میں دو چار دن رہنے کے بعد اس کی طبیعت اکتا جاتی ہے اور بار بار یہ الفاظ زبان پر لاتا ہے۔ ''خیال کرو۔ صرف دو چار اونس صاف آکسیجن کے لیے ہم اس ویرانے میں آ بسے ہیں''۔ اپنے افسانوی مجموعوں کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں کبھی چمک پیدا نہیں ہوتی۔ میں نے اسے کبھی اپنے افسانے کی تعریف کرتے نہیں سنا۔ دراصل وہ گزشتہ تحریروں سے بہت جلد بیزار ہو جاتا ہے۔ اور نئے نئے تجربوں کی دھن میں اپنا بہت کچھ پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔

پہلی ملاقات میں اس کے مداحوں کو اس سے مل کر اکثر مایوسی ہوتی ہے۔ میانہ قد، گندمی رنگ اور جواں سال۔ وہ اگر کالج کا چھوکرا نہیں تو زیادہ سے زیادہ سول سیکرٹریٹ کا کلرک دکھائی دیتا ہے۔ عام ہندوستانیوں کی طرح اسے باتیں بنانے کا شوق نہیں۔ آپ اس سے گھنٹوں باتیں کیے جائیں۔ وہ چپ چاپ خاموش، مہیوت بنا بیٹھا رہے گا، یا آپ کا جی رکھنے کے لیے کبھی کبھی مسکرا دے گا۔ اس کی مسکراہٹ ہمیشہ ہلکی اور نرم ہوتی ہے۔ مونا لزا کی طرح مسکراتے مسکراتے تھک جائے گا، تو تھوکنا یا ناک صاف کرنا شروع کر دے گا۔ اس کی ناک میں نقص ہے جس کی وجہ سے اسے اکثر زکام کی شکایت رہتی ہے۔ ''بدصورت عورتوں کے بعد زکام ہی وہ لعنت ہے''۔ وہ کہا کرتا ہے ''جس سے میں عمر بھر پیچھا نہیں چھڑا سکا''۔ مسکراہٹ کے علاوہ اس

کی آنکھوں میں ایک عجب قسم کا حزن وملال ہے، ایک قسم کی ازلی ابدی حسرت جو میں نے کشمیری بچوں کی آنکھوں میں دیکھی ہے۔

اس سے ملنے کے بعد..... ہر شخص کو شک گزرتا ہے کہ وہ افسانے خود نہیں لکھتا بلکہ کسی سے لکھواتا ہے، دراصل جلوت کا کرشن چندر خلوت کے کرشن چندر سے بالکل مختلف ہے۔ جلوت میں وہ تکلف اور سنجیدگی کا نقاب اوڑھے رہتا ہے۔ وہ صرف بے تکلف دوستوں کی محفل میں کھلتا ہے اور بخدا جب کھلتا ہے تو امریکن پیراشوٹ کی طرح ''بے پناہ'' ہو کر کھلتا ہے اور اسی وقت اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ دلچسپ چوٹیں کرتا ہے، نشاتین کے جھگڑے چکا سکتا ہے اور دل کے پھپھولوں اور سینہ کے داغوں کی نمائش بھی کر سکتا ہے۔ نفاست پسندی اس کی سرشت میں داخل ہو چکی ہے۔ وہ کبھی معمولی کپڑے نہیں پہنتا۔ رذیل ہوٹل میں قیام نہیں کرتا۔ معمولی درجے میں سفر نہیں کرتا اور گھٹیا قسم کی نثر نہیں لکھتا اور اکثر کہتا ہے۔ ''وہ نثر ہی کیا، جس کے ہر فقرہ میں مزاح کی چاشنی یا شعریت کی رنگینی نہ ہو''۔ اس کی زندگی کا کوئی اصول ہے تو وہ ہے ''سمجھوتا'' وہ مہاتما گاندھی کی طرح قدم قدم پر سمجھوتا کرنے کو تیار ہے۔ وہ ان ادباء سے آن واحد میں سمجھوتا کر لیتا ہے۔ جنہیں ساری عمر کوستا رہا ہے۔ وہ ان رشتہ داروں کے ناز اٹھانے کے لیے فوراً تیار ہو جاتا ہے، جو اسے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ وہ اس ہنسی سے بھی سمجھوتا کر لیتا ہے جو رونے سے مشابہت رکھتی ہے۔ چند آدمیوں سے اسے ازلی بیر ہے۔ مثلاً پنڈت، لالے، للائنیں، بد صورت عورتیں۔ اگر اس کا بس چلے تو انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دے لیکن اس کا بس نہیں چلتا اور وہ ان سے بھی سمجھوتا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

جب وہ سرینگر کے بازاروں میں للائنوں کو وہی کے بڑے اور بیسن کے پکوڑے کھاتے ہوئے دیکھتا ہے تو غصہ سے چیخ اٹھتا ہے۔ سالیاں چار سو میل کا سفر اس نعمت کو چکھنے کے لیے کرتی ہیں''۔

کرشن چندر طفل مکتب اور معرفلسفی کا دلچسپ مرکب ہے۔ لذیذ کھانا دیکھ کر بچوں کی طرح چٹخارے لینے لگتا ہے۔ ہمسائے کو ڈرانے کے لیے پہلگام میں آدھی رات کے وقت منہ میں انگلیاں ڈال کر سیٹیاں بجاتا ہے۔ اتنی شہرت حاصل کرنے کے باوجود اپنے نام کے ساتھ ''ایم اے'' کا دم چھلا لگاتا ہے۔ اس کا فلسفہ لینن اور شلی کے فلسفہ کا امتزاج ہے۔ وہ پرانے نظام کو

دھما کا سے پھٹنے والے بم سے اس طرح اڑا دینا چاہتا ہے کہ مزہ آ جائے۔ ''کائنات کو مٹھی میں اس طرح بھینچنا چاہتا ہے، کہ چرمر ہو جائے''۔ اسے طبقاتی نظام سے نفرت ہے۔ لاری میں فرسٹ کلاس میں سفر کرتا ہے، لیکن سیٹ پر بیٹھتے ہی سوچنے لگتا ہے کہ انسان نے ہر جگہ پہلا، دوسرا، تیسرا درجہ کیوں بنا رکھا ہے، جماعت بندی ہمیشہ اس کی آنکھوں میں کھٹکتی ہے، کشمیری ہاتوؤں کو صاحب لوگوں کے گھوڑوں کے ساتھ دوڑتے ہوئے دیکھ کر اس کا خون ابلنے لگتا ہے اور جب وہ کشمیر کے متعلق رندی اور ہوسنا کی کی داستانیں سنتا ہے تو سرد آہ بھر کر کہتا ہے۔ ''کتنے افسوس کی بات ہے کہ لوگ اس جنت میں فقط حور وغلمان تلاش کرنے آتے ہیں''۔

کشمیر سے اسے والہانہ عشق ہے لیکن وہ کاشمیری نہیں۔ وہ صرف اسی نسبت سے کاشمیری ہے، جس نسبت سے لاہوری، دہلوی، لکھنوی، پونوی یا بمبے وی ہے۔ وہ نہ کشمیری بول سکتا ہے نہ سمجھ سکتا ہے لیکن کشمیری زبان سن کر اس کا دل مسرت سے اچھلنے لگتا ہے۔ ''کتنے شیریں بول ہیں کشمیری زبان کے''۔ وہ حیرت سے ہاتوؤں کے منہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے۔

کرشن چند اچھے افسانے تب لکھتا ہے جب پانی برس رہا ہو۔ جب وہ کسی ''لالہ رخ'' کے کاشانے میں جلوہ افروز ہو، جب اسے پیسوں کی سخت ضرورت ہو، وہ عموماً ایک نشست میں افسانہ لکھ لیتا ہے، اور لکھتے وقت بہت کم الفاظ کاٹتا ہے۔ بیشتر اس کا نقشِ اول ہی نقشِ آخر ثابت ہوتا ہے۔ بسا اوقات اس کے افسانوں کی بنیاد کوئی ذاتی حادثہ یا سانحہ ہوتا ہے۔ اسے زندگی میں کافی حادثوں سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک دفعہ یرقان میں سخت مبتلا ہوا۔ دو دفعہ باؤلے کتے نے کاٹ کھایا۔ ایک بار کالج سے بھاگ گیا اور ہگلی کے پل میں پناہ گزین ہوا۔ ایک دفعہ پولیس کے ڈر سے چھت پر سے چھلانگ لگا دی اور متعدد بار حسین لڑکیوں سے اس لیے شادی نہ کر سکا کہ اس کے پاس موٹر کار نہ تھی۔ موٹر کار کو وہ نہایت کام کی چیز سمجھتا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ کوئی شخص سیاست یا عشق میں کامیاب نہیں ہو سکتا، جب تک اس کے پاس موٹر کار نہ ہو۔

پرائیویٹ زندگی میں کرشن چندر شمعِ خاموش ہے۔ اس نے یہ سمجھ کر کہ صرف چیخنے سے اندھیرا دور نہیں ہوتا، ہر رنگ میں جلنا منظور کر لیا ہے۔ اپنے افسانوں میں وہ اس فرشتے کی طرح چلاتا ہے جو عرش سے اڑ کر زمین پر اترے اور حضرت انسان کی خباثت، کمینگی اور بربریت کو دیکھ

کرغم وغصہ سے بلبلا اٹھے۔انگریزی شاعر شیلے کی طرح وہ ہمیشہ آنے والی حسین دنیا کے خواب دیکھتا ہے، یک ایسی دنیا جس میں نوجوان لڑکیاں وحشی ہرنیوں کی طرح چوکڑیاں بھرتی پھریں، مزدور رندناتے نظر آئیں اور ہر عورت ہیلن آف ٹرائے اور ہر محبوبہ کلوپیٹرا بنی ہوئی ہو۔ لیکن جب زندگی میں اسے یہ چیزیں نہیں ملتیں تو ان کھلونوں سے دل بہلاتا ہے جو ایامِ طفلی سے اس کی تسکین کا باعث بنتے رہے ہیں۔یعنی ایک عدد موٹر کار، چند احباب، ایک درجن اچھی کتابیں اور لذیذ کھانے پکانے والی معمولی خدوخال کی بیوی!

☆☆☆

کلکتے کا ذکر

لاہور سے کلکتہ کا سفر درپیش ہو، تو دو ہی طریقے ہیں۔مقدور ہو تو ہوائی جہاز میں سفر کیجئے۔ناشتا لاہور میں اور شام کا کھانا کلکتہ میں کھائیے اور مقدور نہ ہو تو تھوڑا سا کلورو فارم جیب میں رکھ کر سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں بیٹھ جایئے۔جونہی گاڑی روانہ ہو، اللہ کا نام لے کر کلورو فارم سونگھنا شروع کر دیجئے۔جب آپ کو ہوش آئے گا تو آپ اپنے آپ کو لکھنؤ کے اسٹیشن پر پائیں گے۔ایک بار کلورو فارم پھر سونگھیے اور ہوش آنے تک بردوان پہنچ جایئے۔ بردوان سے ہوڑہ نزدیک ہے اس لیے کلورو فارم کو احتیاط سے بیگ میں رکھ لیجئے کہ واپسی کے وقت کام آئے۔اگر آپ اس طریقہ پر عمل نہیں کریں گے تو صبر اور انتظار کرتے کرتے چاہے آپ ختم ہو جائیں۔سفر نہیں ختم ہوگا۔آپ لاکھ جتن کریں، ہم سفروں سے گپیں ہانکیں، رسائل کی ورق گردانی کریں، کلکتہ میل کو گالیاں دیں۔جمائیاں لیں لاحول پڑھیں۔لیکن منزل قریب ہوتی نظر نہیں آئے گی۔

کلکتہ کی ہر چیز نرالی ہے۔اس کو ہی لیجئے کہ کلکتہ نام کا کوئی ریلوے اسٹیشن نہیں۔حالانکہ کلکتہ شہر میں درجنوں مقامی سٹیشن ہیں۔کلکتہ کی گھڑیاں باقی شہروں کی گھڑیوں سے ایک گھنٹہ آگے رہتی ہیں (اس بوالعجبی کو کلکتہ ٹائم کہتے ہیں) کلکتہ میں لوگ بیڈمشن بجلی کی روشنی میں کھیلتے ہیں، ہوٹلوں میں پانی بوتلوں میں پیش کیا جاتا ہے، کلکتہ میں ہندوستانی فلمیں۔بنتی ہیں جنہیں عموماً وہ لوگ ڈائرکٹ کرتے ہیں جو ہندوستانی نہیں جانتے۔کلکتہ میں ''س'' ''ش'' ہو جاتا

ہے۔ ٹانگہ، گھوڑا گاڑی اور شلوار، ساڑھی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ویسے تو کلکتہ میں ہر صوبہ اور قماش کا انسان دیکھنے میں آتا ہے، لیکن سب سے دلچسپ آدمی کلکتہ کے اصلی باشندے ہیں۔ سانولے سلونے متین۔ بخل کی حد تک کفایت شعار۔ سادگی اور بھلمنساہٹ کے پتلے۔ نگاہ اولیں میں بنگالی بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے گفتگو کرنے کے بعد پتا چلتا ہے کہ ہر بنگالی وہ نہیں جو نظر آتا ہے۔ دراصل ہر بنگالی کی بات میں ایک نکتہ ہوتا ہے جسے صرف ایک دوسرا بنگالی ہی سمجھ سکتا ہے۔ اگر آپ کوشش کر کے اس نکتہ کو پا بھی لیں تو بنگالی بابو جھٹ پینترا بدل کر ایک اور نکتہ پیدا کر دیتا ہے اور یہ سلسلہ تب تک جاری رہتا ہے، جب تک آپ چکرا کر اپنی ہار مان نہیں لیتے۔ بنگالی بابو دو طرح سے اپنے حریف کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ باتیں بنا کر یا بالکل خاموش رہ کر۔ اگر وہ نوجوان ہے تو بڑھ بڑھ کر باتیں کرے گا۔ اگر ادھیڑ عمر کا ہے تو فلسفیوں کے انداز میں گھنٹوں مراقبہ میں بیٹھا نظر آئے گا۔ بیشتر بنگالی چالیس برس کی عمر کو پہنچنے کے بعد مسکرانا اور ہنسنا ترک کر دیتے ہیں اور اونگھنا یا بڑبڑانا شروع کرتے ہیں۔ خدوخال کے اعتبار سے بنگالی لوگ دو قسموں میں بانٹے جا سکتے ہیں۔ بنگالی جن کا چہرہ فٹ بال یا رس گلا سے ملتا ہے اور بنگالی جن کا چہرہ بوتل یا بیلن سے مشابہت رکھتا ہے۔

اول الذکر کے گال ضرورت سے زیادہ پھولے ہوئے اور موخر الذکر کے گال ضرورت سے زیادہ پچکے ہوئے ہوتے ہیں۔ کلکتہ میں حسن ملیح کی فراوانی ہے۔ اس شہر میں حسن صبیح کی تلاش کرنا صحرا میں سبزہ زار کی جستجو کرنے کے مترادف ہے۔ چراغ لے کر بھی ڈھونڈیں تو رخ روشن تو کیا ''بجھی ہوئی شمع'' بھی کہیں نظر نہیں آئے گی۔ ''بالی عمریا'' ''پتلی کمریا'' اور ''سانوری صورتیا'' قدم قدم پر ملتی ہے لیکن وہ قندیلیں جن کی تجلی کے سامنے عشق کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں، کلکتہ کے حصہ میں نہیں آئیں۔

کلکتہ میں زندگی صرف چار محوروں کے گرد گھومتی ہے۔ روپیہ، بوتل، گھوڑا، لڑکی، یہاں ہر شخص روپیہ کمانے کے لیے آتا ہے، سوائے پنجابیوں کے، جن کا شغل ہر ملک اور ہر شہر میں روپیہ خرچ کرنا ہے۔ کروڑ پتی مارواڑی سیٹھ سے لے کر بنگالی رکشہ کھینچنے والے تک ہر شخص کی نگاہ کسی کی جیب پر ہے۔ روپیہ کمانے کی دھن میں لوگ اس برق رفتاری سے ادھر ادھ بھاگتے ہیں کہ

انسان انہیں دیکھ کر بدحواس ہو جاتا ہے۔ یہاں کسی شخص کو ایک منٹ کی فرصت نہیں، تاجروں اور سوداگروں سے لدی ہوئی کاریں، ٹریمیں، ٹیکسیاں کلکتہ کی سڑکوں پر جب زناٹے بھرتی ہوئی گزرتی ہیں تو ایک نووارد کو یہ شک گزرتا ہے کہ وہ کلکتہ نہیں بلکہ لندن یا نیویارک کے مضافات میں آ پہنچا ہے۔ ٹریفک کا یہ حال ہے کہ سڑک کو پار کرنے کے لیے کئی دفعہ پورے تیس منٹ انتظار کرنا پڑتا ہے۔ آپ ہمت کر کے ایک یا دو گز آگے بڑھتے ہیں۔ دائیں طرف سے پچاس موٹریں اور بائیں طرف سے اتنی ہی ٹریمیں آپ کو للکار کر کہتی ہیں۔ ''خبردار'' اگر کوئی شخص موٹر کے نیچے آ کر خودکشی کا ارادہ رکھتا ہو تو اس کے لیے کلکتہ کی سڑکیں نہایت موزوں ہیں۔

''بیوپار میں روپیہ کماؤ، ریس میں گھوڑوں پر داؤ لگاؤ، ہوٹلوں میں شراب پیو۔ اگر کسی طرح بھی دل نہ بہلے تو کسی سے آنکھیں لڑاؤ''۔ کلکتہ میں امیر طبقہ کے یہی مشاغل ہیں۔ کلکتہ تجارت کا مرکز ہے۔ دیگر اجناس کی طرح یہاں حُسن کی تجارت بھی اگر دن دونی نہیں تو یقیناً رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ اس جنس کے دلال عموماً ہوٹلوں اور سینما گھروں کے گرد و نواح میں دیکھے جاتے ہیں۔ گربۂ مسکین، منکسر المزاج، مفلوک الحال، یہ لوگ جو عموماً میرٹھ، بلند شہر اور لکھنؤ سے کلکتہ میں آتے ہیں۔ بڑے کام کے آدمی ہیں۔ شریف الطبع اتنے کہ ہر راہرو سے پوچھ لیتے ہیں۔ ''صاحب چاہیے''؟ اگر آپ انہیں دھتکاریں تو برا ماننے کی بجائے شاعری شروع کر دیتے ہیں۔

''برس تیرہ کا یا چودہ کا سن''۔

''ستم کی چال، ستم کی ادا، ستم کی نگاہ''۔

''ابھی نتھ بھی نہیں اتری صاحب''۔

کلکتہ میں ایک مثل مشہور ہے کہ اگر آپ نے کلکتہ کی ریس نہیں دیکھی تو کچھ بھی نہیں دیکھا۔ کلکتہ کی ریس واقعی عجیب تماشا ہے۔ دیوانوں کا سب سے بڑا ہجوم دیکھنا مطلوب ہو تو کلکتہ کی ریس ضرور دیکھئے۔ اتنا بڑا ہجوم بڑے سے بڑے سیاسی جلسہ یا جلوس میں بھی آپ کو نظر نہیں آئے گا۔ اس ہجوم کو کہ جو تمام صوبوں کے لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے، دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہندوستان کی آبادی چالیس کروڑ نہیں بلکہ اسی کروڑ ہے۔ ہر ایک شخص کے ہاتھ میں

ریس کی کتاب ہے جس کا وہ اس انہماک سے مطالعہ کر رہا ہے جیسے وہ نہایت دلچسپ ناول ہے۔ ایک دوسرے سے ٹپ (TIP) لیے جا رہا ہے۔ قیاس کی گھوڑے دوڑائے جا رہے ہیں۔ اپنے اپنے گھوڑے کی تعریف میں قصیدے کہے جا رہے ہیں۔ یک لخت گھنٹی بجتی ہے۔ جوں جوں گھوڑے نزدیک آتے جاتے ہیں۔ تماش بین گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ ایک با آواز بلند پکار رہا ہے۔ ''بھائی صاحب بھائی صاحب''۔ دوسرا زور زور سے چیخ رہا ہے ''بھابی جان بھابی جان'' یہ نعرے سن کر ایک نووارد یہی سمجھتا ہے کہ بھائی صاحب، بھابی جان کی معیت میں ریس کورس میں تشریف لا رہے ہیں لیکن اسے بعد کو پتہ چلتا ہے کہ ''بھائی صاحب'' اور ''بھابی جان'' تو گھوڑوں کے نام ہیں۔ جس وقت فاصلہ دو ایک فرلانگ رہ جاتا ہے، اس وقت ہجوم کی حالت دیدنی ہوتی ہے جو بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ ناچنا شروع کر دیتے ہیں جو ناچ رہے ہیں وہ ایک دوسرے سے بغلگیر ہونے لگتے ہیں۔

کلکتہ کی ریس کے بعد کلکتہ میں دوسری قابل دید چیز فلمی سٹوڈیوز ہیں۔ یہ سب کے سب تقریباً ٹالی گنج میں واقع ہیں۔ ٹالی گنج ہوڑہ سٹیشن سے کافی دور اور قبرستان کے کافی نزدیک ہے۔ چونکہ فلمیں بنانے والے شور و شغب اور تنقید و تبصرہ سے گھبراتے ہیں، اس لیے انہوں نے سٹوڈیوز قبرستان کی بغل میں بنائے ہیں۔ ہر ایک سٹوڈیو کا ایک دربان ہوتا ہے جو اردو شاعری کے روائتی دربان کی طرح بے حد مغرور اور بد دماغ ہوتا ہے۔ جب تک آپ دس بارہ دفعہ کورنش بجانہ لائیں، آپ کو سٹوڈیو کی حدود میں داخل نہیں ہونے دے گا۔ فلمی سٹوڈیو چھوٹے پیمانے پر عجائب گھر اور چڑیا گھر کا مرکب ہوتا ہے۔ یہاں ہر ایک شے اور ہر ایک شخص عجوبہ روزگار ہے۔ کلکتہ کے سٹوڈیوز میں عموماً ہر ایک شخص پر کسی دوسرے شخص کا دھوکا ہوتا ہے۔ مثلاً اپ جسے مسخرا سمجھ رہے ہیں، وہ مسخرا نہیں ڈائریکٹر ہے۔ جسے آپ پنواڑی سمجھتے ہیں، وہ پنواڑی نہیں سیٹھ صاحب ہیں۔ جسے آپ نے بزرگ سمجھ کر سلام کیا ہے، وہ بزرگ نہیں بلکہ چھوکرا ہے۔ جس نے مصنوعی ڈاڑھی لگا رکھی ہے، جسے آپنے آکسٹرالڑکی سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہے۔ وہی دراصل ہیروئن ہے۔ جن سرگیس پلکوں کی آپ تعریف کر رہے ہیں، وہ دراصل سرگیس پلکیں نہیں، بلکہ نہایت معمولی پلکیں ہیں، جن پر ایک خاص مصالحہ لگایا گیا ہے۔ جس زلف دراز کی طرف آپ

غور سے دیکھ رہے ہیں، وہ در اصل مانگنے کی زلف دراز ہے۔ بعض اوقات سٹوڈیو میں ہیرو، ڈائریکٹر اور پروڈیوسر میں تمیز کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ عام طور پر جو شخص سب سے زیادہ شور مچائے وہ ڈائریکٹر، جو آکسٹرا لڑکیوں کے جھرمٹ میں کھڑا ہوا مسکرا رہا ہو، وہ ہیرو اور جو ہیروئن کے ارد گرد منڈلا رہا ہے، وہ پروڈیوسر ہوتا ہے۔ ہر سٹوڈیو کی طرح کلکتہ کے سٹوڈیوز میں تین اصطلاحیں کثرت سے استعمال کی جاتی ہیں۔ مثلاً ہٹ سانگ'' ہٹ سانگ وہ گانا ہوتا ہے جسے فلم دیکھنے کے بعد کوچوان، ٹیکسی ڈرائیور اور اس قماش کے لوگ گاتے ہیں۔ ''فلاپ''، اس فلم کو کہتے ہیں جس کی ناکامیابی کی خبر سن کر پروڈیوسر کے قلب کی حرکت بند ہو جاتی ہے۔ ''مکھن لگانا'' یعنی حد سے زیادہ چاپلوسی کرنا۔ کلکتہ کے سٹوڈیوز میں اکثر مکالمہ نویس، ڈائریکٹر کو مکھن لگاتا ہے، ڈائریکٹر پروڈیوسر کو پروڈیوسر ہیروئن کو اور ہیروئن کسی کو مکھن نہیں لگاتی۔

کلکتہ میں جن چیزوں کے لیے جی ترس جاتا ہے۔ وہ ہیں، کڑاکے کی سردی، پکی ہوئی گندم کے سنہری گھیت، بیلوں کی طرح بل کھاتی ہوئی لٹھے کی شلواریں، بھرے بھرے جسم والی عورتیں، وزنی پنجابی گالیاں۔ کیکر اور جنڈ کے ذلیل درخت اور کلکتہ سے واپس آ کر جن چیزوں کی یاد مدت تک دماغ کے تہہ خانوں میں رینگتی رہتی ہے، وہ ہیں پنچم میں گاتی ہوئی کوئلیں، تالابوں پر لہراتے ہوئے ناریل کے سائے۔ چاندی کی طرح دمکتا ہوا ہوڑہ کا پل، قطب منار کی منہ چڑاتی ہوئی سربفلک عمارتیں، نرگس کو شرماتی ہوئی خوبصورت بنگالی آنکھیں، گھٹی گھٹی فضا، دبی دبی سسکیاں اور ہگلی کا غلیظ پانی!

☆☆☆

عورت، محبت، زندگی، انسان

ایک نقاد کی رائے میں جس شخص نے عورت، محبت، زندگی اور انسان کے متعلق کچھ نہیں لکھا، وہ ادیب کہلانے کا مستحق نہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر اس سہل شرط کو پورا کرنے سے انسان ادیب بن سکتا ہے تو کیوں نہ ان موضوعات پر طبع آزمائی کی جائے۔

عورت، عورت ''جملہ شرطیہ'' ہے یا ''فعل تمنائی''۔ عورت، ماں بیوی بہن ہے اور محبوبہ، گلہری ہے مچھلی، شوخ اور شریر گلہری جو تعاقب کرنے والے کی بے بسی پر قہقہہ استہزا بلند کرنے

کے بعد درخت کی سب سے اونچی شاخ پر جا پہنچتی ہے۔ایک ایسی چالاک مچھلی جو کبھی جال میں نہیں پھنستی اور اگر پھنستی ہے تو ہاتھ سے پھسل کر پانی میں جا گرتی ہے۔عورت دبیز پردہ ہے یا سیاہ نقاب، مجسم بے نیازی ہے یا مجسم بے اعتنائی۔عورت ارض مشرق میں صید اور ارض مغرب میں صیاد ہے۔عورت ہندوستان میں آنسو۔ٹرکی میں مسکراہٹ اور انگلستان میں خندۂ بیباک ہے۔عورت محبت کرتی ہے۔تو ابوالہول کی پہیلی۔نفرت کرتی ہے تو بھپری شیرنی اور حسد کرتی ہے تو کڑکتی ہوتی بجلی ہے۔اس کا سب سے بڑا مطالبہ خوشامد، سب سے بڑا راز دان آئینہ اور سب سے بڑی کمزوری محبت ہے۔

محبت۔محبت پچاس فی صدی حماقت اور پچاس فیصدی تضیع اوقات ہے۔محبت کے تین درجے ہیں۔حماقت، شدید حماقت اور عشق۔محبت وہ دروازہ ہے جو بسا اوقات پاگل خانے میں کھلتا ہے۔محبت ایک تاجر ہے جو صرف آہوں اور آنسوؤں کا بیوپار کرتا ہے۔محبت ایک تمثیل ہے جس میں صرف دو کردار ہوتے ہیں اور دونوں غایت درجہ مضحکہ خیز۔محبت یتشہ ہے جو اتنا سادہ لوح ہے کہ پہاڑوں کو کاٹنے کی جسارت کرتا ہے۔محبت کچھ گھڑا ہے جو اپنی مضبوطی کے زعم میں چناب کے وسیع پاٹ کو خاطر میں نہیں لاتا۔

زندگی۔کوئی شخص زندگی کو تشبیہوں اور استعاروں کی مدد کے بغیر بیان نہیں کر سکتا۔شیخ سعدی سے لیکر شیخ چلی تک ہر ایک مفکر نے زندگی کو اسی انداز میں دیکھا اور جانچا ہے۔میری رائے میں زندگی علی بخش حجام کا کند استرا ہے جس کے چرکوں کی کوئی تاب نہیں لا سکتا، حتیٰ کہ خود علی بخش حجام بھی!

زندگی چھانگا مانگا کا اسٹیشن ہے۔بے رونق، اداس، خستہ حال۔زندگی وہ سڑک ہے، جس پر چلتے چلتے کئی آدمی جہنم میں پہنچ جاتے ہیں، زندگی اس سڑک پر بھاگتا ہوا باؤلا کتا ہے، جو ہر راہرو کو کاٹنے کے بعد کسی تالاب میں ڈوب مرنے کی بجائے زندہ رہتا ہے۔زندگی مصر کی شہزادی کلوپیٹرا ہے جو ہر عاشق کی محبت کا دم بھرتی ہے۔مگر جو کسی سے وفا نہیں کرتی۔زندگی سرکش گھوڑا ہے، جس پر سوار ہونے کی ہر شخص کوشش کرتا ہے لیکن جو ہر شہسوار کو زمین پر پٹخ کر ہوا ہو جاتا ہے۔زندگی خوبصورت تیتری ہے جو اپنے شوخ اور خوبصورت پر دکھا کر ہر شخص کو تعاقب

کرنے پر ورغلاتی ہے، لیکن جو آنِ واحد میں پھولوں سے لدی ہوئی جھاڑی میں غائب ہو جاتی ہے۔ زندگی ''علی بابا اور چالیس چوروں'' کی کہانی میں وہ دروازہ ہے جس پر ہر شخص دستک دیتا ہے لیکن جو اس لیے نہیں کھلتا کہ سم سم کا اسم اعظم کسی کو یاد نہیں۔ زندگی موسم برسات میں خستہ حال سرائے ہے، جس میں اتنے مچھر ہیں کہ مسافروں کو تمام رات سونے نہیں دیتے۔ زندگی الجبرا کا سوال ہے جسے حل کرنے کے لیے عمر درکار ہے لیکن جس کا جواب صفر ہے۔ زندگی۔ زندگی قرونِ وسطیٰ کے قاضی کا درہ ہے، جس شخص کی پیٹھ پر پڑتا ہے، تڑاق سے پڑتا ہے، زندگی میرا جی کی نظم ہے، جس کے ایک سے زیادہ مطلب ہو سکتے ہیں۔ زندگی جوگی کا پٹارہ ہے جس میں ایک سے زیادہ سانپ پھنکار رہے ہیں۔ زندگی ہندوستانی مدیر کا ایڈیٹوریل ہے، طویل لاتناہی، بے معانی۔ زندگی سیکنڈ ہینڈ کار ہے، جو کبھی اس تیزی سے زنانے بھرتی ہے کہ آدمی بدحواس ہو جائے اور کبھی اس وقت تک حرکت نہیں کرتی جب تک دس آدمی اس کو دھکا نہ لگائیں۔ زندگی صحرائے اعظم ہے، جس میں تمباکو، شراب اور عورت تین نخلستان ہیں۔ زندگی بھڑکتا ہوا تنور ہے، جس میں جو چیز گرتی ہے جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔ زندگی جھینگر کی ٹرٹر ہے، مسلسل اور بے ہنگم۔ زندگی سریلی تصویر ہے، جس کا نہ منہ ہے نہ سر۔ زندگی گنجے آدمی کی چندیا ہے، صاف، شفاف، بنجر۔ زندگی بند گلی ہے، جس میں سے نکلنے کا کوئی دروازہ نہیں۔ زندگی دلدل ہے، جس میں ہر شخص کچھ اس طرح دھنس جاتا ہے کہ نہ خود نکل سکتا ہے نہ اسے نکالا جا سکتا ہے۔

انسان..... انسان لباس پہننے والا جانور ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ کیونکہ لومڑی سے زیادہ چالاک، بھیڑیئے سے زیادہ خونخوار اور اونٹ سے زیادہ کینہ ساز ہے۔ ڈارون کے نظریہ کے مطابق انسان کے آباء واجداد بندر تھے۔ اس لیے سب سے زیادہ تب چڑتا ہے جب اسے آئینہ دکھایا جائے۔ تہذیب اور تمدن کی چناچنی کے باوجود انسان ابھی تک کولھو کا بیل ہے جو ہزاروں میل کا چکر کاٹنے کے بعد وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں سے چلا تھا۔

ان چار موضوعات پر لکھنے کے بعد میں محسوس کرتا ہوں کہ نقاد کی رائے غلطی پر مبنی ہے۔ کیونکہ ان پر لکھنے کے باوجود بھی انسان ادیب نہیں بن سکتا۔

☆☆☆

صداقت

ایک دفعہ نجانے خدا کو کیا سوجھی کہ اس نے چلّا کر کہا۔ ''صداقت!'' چشمِ زون میں دنیا میں صداقت کا ڈنکا بجنے لگا اور بے چارہ جھوٹ دم دبا کر دنیا سے بھاگ گیا۔ تمام لوگ حتیٰ کہ وکلاء اور سیاست دان بھی سچ بولنے لگے۔ چنانچہ جب اس دن مسٹر پی پی مکرجی بار ایٹ لاء اپنے موکل سیٹھ رام دیال کی طرف سے کہ جس نے قتل کا جرم کیا تھا، ہائیکورٹ میں پیش ہوئے تو انہوں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''مائی لارڈ! میرا موکل سیٹھ رام دیال پرلے درجے کا بدمعاش ہے۔ اس سے پہلے دو چار دفعہ قتل کے جرم کا ارتکاب کر چکا اور ہر بار مشہور و معروف وکلا کی مدد اور رسوخ سے قانون کے شکنجے سے بچتا رہا ہے۔ اس نے مجھے خود بتایا کہ اس نے مقتول کو معمولی سی بات پر پستول کا نشانہ بنایا اور اس کا بس چلتا تو وہ مقتول کی بیوی اور بچوں کو بھی قتل کیے بغیر نہ چھوڑتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس نے مقتول کو اس بے دردی سے قتل کیا ہے کہ وہ سخت سے سخت سزا کا مستوجب ہے، اس کے تمام گواہ جھوٹے ہیں کیونکہ ان سب نے رشوت لے کر گواہی دی ہے۔ مائی لارڈ! میں عدالت کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ملزم کو پھانسی کی سزا دی جائے۔ مبلغ تین ہزار روپے جو میں نے بطور فیس ملزم سے لیے تھے۔ وہ میں آپ کی موجودگی میں اسے واپس کرتا ہوں۔ مائی لارڈ! مجھے بے حد مسرت ہوگی اگر سیٹھ رام دیال جیسا شہدا اور غنڈہ کیفر کردار کو پہنچے''۔

سیاستدانوں کی ایک مجلس میں وزیر اعظم نے ایک پسماندہ ملک کے نمائندے کو مخاطب کرتے ہوئے یہ تقریر کی:۔

''جناب من! امر واقعہ یہ ہے کہ ہم آپ کے ملک پر اس لیے حکومت کرنا چاہتے ہیں کہ ہمیں پٹرول اور مٹی کے تیل کی سخت ضرورت ہے۔ یہ سراسر غلط ہے کہ ہم آپ کو تہذیب سکھانا چاہتے ہیں، کیونکہ جہاں تک تہذیب کا سوال ہے آپ کا ملک ہمارے ملک سے کہیں زیادہ مہذب ہے۔ پٹرول اور تیل کے علاوہ ہماری آنکھ آپ کے گندم کے ذخیروں اور سونے چاندی کی کانوں پر بھی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ فوجی لحاظ سے آپ کا ملک اتنا کمزور ہے کہ اسے دیکھ کر بے ساختہ ہمارے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ اگر آپ کے پاس کافی تعداد میں ٹینک اور

بمبار ہوتے تو ہم کبھی آپ کے ملک کا رخ نہ کرتے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہمیں آپ کے ملک کو لوٹنے کا کوئی حق نہیں لیکن کیا کیا جائے۔ آپ بدقسمتی سے کمزور واقع ہوئے ہیں اور اس وقت دنیا میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اصول کارفرما ہے''۔

جلال مووی ٹون والوں نے اپنی نئی فلم کا اشتہار مندرجہ ذیل الفاظ میں دیا:

''ہماری تازہ فلم کا نام ''دمادم مست قلندر'' ہے۔ ملاحظہ فرمائیے، کتنا بیہودہ نام ہے۔ کہانی ڈائریکٹر صاحب نے لکھی ہے جنہیں کہانی لکھنے کا مطلقاً تجربہ نہیں۔ دراصل انہوں نے یہ کہانی ہالی وڈ کی چار فلموں سے چرائی ہے۔ لیکن اس سرقہ کے باوجود کوئی بات پیدا نہیں کر سکے۔ مکالمے اور گانے ایک ایسے شخص نے لکھے ہیں جس کا نام لیتے ہمیں شرم محسوس ہوتی ہے۔ ہم نے یہ فلم صرف روپیہ کمانے کی غرض سے بنائی ہے۔ اس لیے آرٹ، اخلاق اور خوش ذوقی کو بالائے طاق رکھ کر اسے تیار کیا گیا ہے۔ ہمیں تعجب نہ ہوگا، اگر اسے ایک بار دیکھنے کے بعد آپ ہم پر ساری عمر لعنت بھیجتے رہا کریں۔ ساری فلم میں ایک منظر بھی دیکھنے سے تعلق نہیں رکھتا۔ ان تمام نقائص کے باوجود اگر آپ ہماری سرپرستی فرمائیں تو یقیناً آپ سے بڑا احمق کوئی نہ ہوگا۔ ہم یہ بھی عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ اگر اس فلم کا نام ''دمادم مست قلندر'' کی بجائے ''محض بکواس'' ہوتا تو یہ فلم کی بہتر ترجمانی کرتا''۔

نہانے کا صابن تیار کرنے والی ایک کمپنی نے اپنے اشتہار میں لکھا:۔

''حضرات! ہم عرصہ سے اپنے صابن کے اشتہار میں لکھ رہے ہیں کہ اس میں چربی استعمال نہیں کی گئی۔ یہ صریحاً غلط ہے، اس کے اجزاء میں چربی کافی مقدار میں شامل کی گئی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر ہم چربی استعمال نہ کریں، تو ہم یہ صابن بنا ہی نہیں سکتے۔ اگر بنا بھی لیں تو اس قیمت میں آپ کو نہیں دے سکتے۔ ہم اس امر کی توضیح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم نے مشہور فلم سٹارز کو معقول رشوتیں دے کر اس صابن کے متعلق ان کی رائیں حاصل کی ہیں۔ ورنہ فلم سٹارز اتنی سادہ لوح نہیں کہ اپنی جلد کی حفاظت کے لیے اس قسم کے گھٹیا صابن کا استعمال کریں۔ ہم عموماً یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ اس صابن کی ''کوالٹی'' میں پچھلے سالوں سے کوئی تغیر نہیں آیا۔ یہ بات بھی دوسری باتوں کی طرح بالکل جھوٹ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سے

ہمارا صابن مقبول خاص و عام ہوا ہے، ہم نے اس کے اجزا سے زیتون کا تیل نکال کر سرسوں کا تیل شامل کر دیا ہے''۔

ایک پیٹنٹ دوا کے اشتہار باز نے اپنے پچھلے اشتہاروں میں اس طرح ترمیم کی:۔

''حضرات! آپ واقعی بہت سادہ لوح واقع ہوئے ہیں کہ ہماری چکنی چپڑی باتوں پر ایمان لے آتے ہیں۔ آپ سے کسی مسخرے نے کہا کہ ''شاشوشن'' تمام امراض کی واحد دوا ہے۔ ذرا سوچیے تو سہی کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ ''شاشوشن'' دراصل چونے کا پانی ہے جس میں ہم نے تھوڑا سا لال رنگ اس لیے شامل کر رکھا ہے کہ آپ کو دوا کی حقیقت کا پتہ نہ چل سکے۔ ممکن ہے، یہ دوا ایک آدھ مرض میں مفید ثابت ہو، لیکن اس کا بیک وقت ہیضہ، پلیگ، اور گنٹھیا کے لیے مفید ہونا ایک ایسی گپ ہے جس پر صرف بے وقوف انسان ہی یقین کر سکتا ہے۔ ہم نے اس دوا کی قیمت پانچ روپے فی بوتل مقرر کر رکھی ہے۔ آپ یہ پڑھ کر حیران ہوں گے کہ ہماری لاگت پانچ آنے بھی نہیں، باقی رہے سارٹیفیکیٹ، ان میں سے تین چوتھائی فرضی ہیں اور باقی ہم نے دوستوں اور رشتہ داروں سے لکھوائے ہیں۔ یہ تو حاکمِ وقت کی ہمارے حال پر مہربانی سمجھیے کہ ہمیں اس دوا کے بیچنے کی کھلی اجازت دے رکھی ہے ورنہ اگر اس دوا کے متعلق ہمارے دعوؤں کی جانچ پڑتال کی جائے تو ہمیں اس وقت جیل میں ہونا چاہیے''۔

ایک لمیٹڈ کمپنی کے ڈائریکٹروں نے اپنی کمپنی کے پراسپکٹس میں لکھا:۔

''ہم چند بیکار لوگوں نے مل کر یہ کمپنی کھولی ہے۔ ہمارا مقصد نہایت واضح ہے۔ یعنی لوگوں کی جیب سے پیسہ نکال کر اپنی جیبیں گرم کرنا۔ ہم پبلک کو سو سو روپے کے دس ہزار حصے خریدنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس طرح ہمارے پاس دس لاکھ روپیہ آ جائے گا۔ ہم یہ روپیہ چند مہینوں میں ہضم کر جائیں گے اور اس کے بعد کمپنی کے دیوالیہ ہونے کا اعلان کریں گے۔ اس کمپنی کو معرضِ وجود میں لانے سے قبل ہم مختلف ناموں سے متعدد جعلی بنک، کمپنیاں اور تجارتی ادارے قائم کر چکے ہیں۔ لیکن پبلک یعنی آپ لوگ کچھ ایسے بے سمجھ واقع ہوئے ہیں کہ ایک دفعہ نقصان اٹھانے کے باوجود پھر ہمارے چنگل میں آ پھنستے ہیں۔ ''ہندوستان کی صنعت و حرفت کو فروغ دینا''، جو ہماری کمپنی کا نصب العین ہے، دراصل ایک بہت بڑا ڈھونگ

ہے۔لیکن اگر آپ کو اس قسم کے سبز باغ نہ دکھائیں تو آپ کا تعاون کیسے حاصل کریں"۔

ایک ڈاکٹر نے ایک مریض کو یہ مشورہ دیا:۔

"جناب من! آپ بالکل بھلے چنگے ہیں۔ میں محض اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے آپ کو طرح طرح کے وہم میں مبتلا کر رہا ہوں۔ اصل میں میرا مقصد دہشت پیدا کرنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ میں جان بوجھ کر خطرناک امراض کے لمبے لمبے نام لے کر آپ کو محتاط رہنے کی تلقین کرتا رہا۔ میں نے آپ کے خون، تھوک، پیشاب کا اس لئے امتحان کرایا، کیونکہ میں نے ہر ڈاکٹر کے ساتھ کمیشن مقرر کر رکھی ہے۔ آپ کی چھاتی میں مطلقاً کوئی نقص نہیں، آپ کے سینہ میں وقتاً فوقتاً جو درد اٹھتا ہے۔ اس کی وجہ "بدہضمی" ہے "دق" نہیں۔ اگر آپ خوراک کے معاملے میں تھوڑی سی احتیاط برتیں تو آپ دو چار دن میں صحت یاب ہو سکتے ہیں۔ وہ جو بارہ ٹیکے میں نے آپ کے بازوؤں میں گھونپے، ان میں نمک کے پانی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ لیکن اس امر کے باوجود میں نے یہ کہہ کر ان میں سونے اور چاندی کے مرکبات شامل ہیں، آپ سے سیکڑوں روپے بٹورے۔ ان ٹیکوں کا آپ کو یہ فائدہ ہوا کہ آپ پہلے سے بھی کمزور ہو گئے اور آپ میں چلنے پھرنے کی سکت نہ رہی۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ آپ میرے پاس نہ آتے تو آپ کے تندرست ہونے کے زیادہ امکانات تھے"۔

ایک پروفیسر نے ایک طالب علم کو سارٹیفکیٹ دیتے ہوئے کہا:۔

میں تصدیق کرتا ہوں کہ رام دیال اول درجے کا نالائق ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے وہ جماعت میں کبھی نچلا نہیں بیٹھتا۔ ہر روز لڑکیوں پر کاغذ کے غبارے، چاک کے ٹکڑے اور کیلے کے چھلکے پھینکا کرتا تھا۔ ایک دفعہ جب میں تختۂ سیاہ پر کچھ لکھ رہا تھا تو اس نے مجھ پر بھی دو گلے سڑے انڈے پھینکے۔ وہ نہ انگریزی لکھ سکتا ہے نہ پڑھ سکتا ہے۔ کیونکہ جس وقت میں انگریزی پڑھاتا تھا، وہ مزے سے چلغوزے کھایا کرتا تھا۔ اس کی عادتیں غائت درجہ گندی گھناؤنی ہیں۔ کام چور وہ اتنا ہے کہ آج کا کام کل کی بجائے پرسوں پر چھوڑتا ہے۔ میں نے اس جیسا گستاخ اور زبان دراز طالب علم زندگی بھر میں نہیں دیکھا۔ ایک دفعہ جب میں نے اسے ایک مضمون میں

فیل کر دیا تو اس نے مجھے قتل کی دھمکی دی۔ مجھے یہ لکھنے میں ذرا بھی باک نہیں کہ جو شخص رام دیال کو ملازم رکھے گا وہ ایک ایسی مصیبت مول لے گا، جس کا کوئی علاج نہیں۔ میرے دانست میں رام دیال طالب علم نہیں۔ ''چلتی پھرتی لعنت'' ہے۔

صداقت کا یہ دور زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا۔ کیونکہ اس نئے دور میں سیکڑوں لوگ بیکار ہو گئے۔ ہزاروں بھوکوں مرنے لگے۔ چوروں، ٹھگوں اور راہزنوں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ تجارت، کاروبار اور صنعت و حرفت میں پہلی سی گہما گہمی نہ رہی۔ کائنات پر ایک گہری افسردگی چھا گئی۔ اور جب خدا نے آسمانوں سے جھانک کر زمین کی طرف دیکھا تو اسے اپنے بندوں پر بے حد ترس آیا۔ اس سے پیشتر کہ وہ پکار کر کہتے ''اے خالق دو جہاں اپنا حکم واپس لے لے''۔ اس نے اپنا حکم واپس لے لیا۔

☆☆☆

ایک لیلیٰ ہزار مجنوں

ایک انار صد بیمار والا معاملہ ہوتا پھر بھی کوئی مضائقہ نہ تھا۔ لیکن یہاں تو ایک لیلیٰ تھی اور ہزار مجنوں! اس پر ستم یہ تمام مجنوؤں کا مزاج لڑکپن سے احمقانہ تھا۔ لیلیٰ نے ان سے سوال کیا۔

''آپ خوامخواہ میرا قافیہ کیوں تنگ کرتے ہیں''۔

ایک مجنون جو شاعر بھی تھا، نے پھبتی کستے ہوئے جواب دیا۔

''محترمہ! آپ کا قافیہ تو پہلے ہی تنگ ہے۔ تھیلا اور کیلا کے سوا لیلیٰ کا کوئی قافیہ ہی نہیں''۔ لیلیٰ لاجواب ہو گئی۔ اس نے اپنی خفت مٹانے کے لیے اعلان کیا۔

''آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔ ایک ہفتہ کے بعد میں آپ کو اپنے فیصلہ سے آگاہ کروں گی''۔

لیلیٰ نے اپنی سہیلی شیلا سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا ''میری مانو تو تھانے میں رپٹ لکھوا دو۔ موئے سب صنفِ نازک سے چھیڑ چھاڑ کرنے کے جرم میں دھر لیے جائیں گے۔ ممکن ہے ان میں کچھ کو (MISA) کے تحت نظر بند ہی کر دیا جائے''۔

''وہ تو صحیح ہے مگر اس میں رسوائی کا ڈر ہے''۔

''تو پھر یوں کرو۔ سوئمبر رچالو!''

''سوئمبر؟ لیکن شرط کیا ہو؟''۔

''جو مجنوں سب سے زیادہ دل دوز آہ بھرے اور آنسو بہائے، اس کے گلے میں جے مالا ڈال دی جائے!''۔

مجنوؤں کو بذریعہ اشتہار مطلع کر دیا کہ اگلے اتوار کو لیلیٰ کی کوٹھی پر سوئمبر کا اہتمام کیا گیا ہے جہاں آہیں بھرنے اور آنسو بہانے کا مقابلہ ہوگا۔

سوئمبر کی شرائط پڑھ کر مجنوں بہت خوش ہوئے اور دن رات ان کی مشق کرنے لگے۔

سوئمبر میں نو سو پچانوے مجنوؤں نے ایک ہی انداز میں آہ بھری کیونکہ انہوں نے ایک ہی امریکن کتاب سے، جس کا نام تھا۔ ''عاشق کو آہ کس طرح بھرنی چاہیے''، یہ طریقہ نوٹ کیا تھا۔ انہیں رد کر دیا گیا تھا۔ باقی پانچ کی آہوں میں کافی انفرادیت پائی گئی۔ ان میں سے ایک پینسٹھ سالہ مجنوں نے کچھ اس انوکھی ادا کے ساتھ اپنے فن کا مظاہرہ کیا کہ لیلیٰ کو فانی بدایونی کا شعر بے اختیار یاد آ گیا۔

اٹھنا واہ تیرے در سے کسی نا مراد کا
اک آہ زیر لب کا سہارا لیے ہوئے

اور آنسو بہاتے وقت جب انہوں نے شیخ ابراہیم ذوق کی طرح دریا ہی بہا دیئے تو سوئمبر سے بھی یہ مسئلہ حل نہ ہو سکا۔

ججوں نے تجویز پیش کی۔ انہیں مزید شرائط پوری کرنے کے لیے کہا جائے۔ چنانچہ اب شرائط وصل۔ لیلیٰ یہ ٹھہریں۔

(1) تین دن کے اندر لیلیٰ کی کوٹھی کی مرمت کے لیے بیس کلو سیمنٹ اور اس کے چہرے کی تازگی کو برقرار رکھنے کے لیے فارن پوڈر لائیے۔

(2) ان دو سوالات کا صحیح جواب دیجئے۔

(ا) گرانی کے دنوں میں زندہ کیسے رہا جا سکتا ہے؟۔

(ب) بڑھتی ہوئی آبادی کا کیا علاج ہے؟۔

ان شرائط کو سن کر تین مجنوؤں کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ باقی دو نے انہیں پوری کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ دوسرے دن وہ مطلوبہ اشیاء اور جوابات کی تلاش میں روانہ ہو گئے۔ سیمنٹ کی جس دکان پر گئے، وہاں یہ سائن بورڈ لگا ہوا پایا۔

''ہم آپ کے لیے آسمان سے تارے اتار سکتے ہیں، جوئے شیر لا سکتے ہیں۔ لیکن سیمنٹ نہیں دے سکتے۔ کم از کم دو سال اور انتظار کیجئے شاید ہم آپ کی کچھ خدمت کر سکیں''۔

یہ سمجھتے ہوئے کہ سیمنٹ کالے بازار میں چلا گیا ہے، انہوں نے اس بازار کے دلال سے ملاقات کی۔ اس نے کہا۔

''سیمنٹ میں تو آپ کو امداد دے سکتا ہوں کہ آپ کو شکوہ کوتاہی داماں ہو جائے۔ مگر دس روپے فی کلو کے حساب سے! قیمت ابھی نقد ادا کر دیجئے۔ سیمنٹ آپ کے گھر پہنچا دیا جائے گا''۔

مجنوؤں کی ایک مشکل آسان ہوئی۔ اب انہوں نے فارن پاؤڈر حاصل کرنے کے لیے تگ و دو شروع کی۔ بیشتر دوکان داروں نے انہیں بتایا۔ اگر آپ تین ماہ پہلے آتے تو ہم آپ کی خدمت میں فرانسیسی، اطالوی، جاپانی پاؤڈر پیش کر سکتے تھے لیکن جب سے چھاپے پڑنے لگے ہیں، فارن پاؤڈر پولیس اٹھا کر لے گئی''۔

ایک مجنوں نے بڑی معصومیت سے سوال کیا۔ ''پولیس اسے کیا کرے گی؟''۔

دوکان دار بولا۔ ''یہی تو ہم سوچ رہے ہیں۔ اگر زنانہ پولیس ہوتی پھر کوئی بات بھی تھی''۔

دوسرے مجنوں نے پوچھا۔ کیا اب فارن پاؤڈر کہیں سے نہیں مل سکتا؟''

''صرف ایک دکان دار سے مل سکتا ہے، مگر وہاں آپ کو ''کیو'' میں کھڑا ہونا پڑے گا''۔

''کوئی بات نہیں ہمیں اس دکان کا پتا بتائیے''۔

جس دکان کا پتا کیا اس کے سامنے ایک فرلانگ لمبا ''کیو'' لگا ہوا تھا۔ دونوں مجنوں اس کے آخر میں کھڑی ہو گئے۔ پانچ گھنٹے کھڑے رہنے کے بعد ان کی کمر میں درد ہونے لگا، ٹھنڈے پسینے چھوٹنے لگے، دن کے وقت تارے نظر آنے لگے، خدا خدا کر کے جب ان کی باری آئی۔ دکان دار نے معذرت چاہتے ہوئے کہا۔

''سٹاک ختم ہو گیا ہے۔کل تشریف لائیے''۔

گھر لوٹتے وقت ایک مجنوں نے ایک لالہ جی کے ہاتھ میں فارن پاؤڈر کا ڈبا دیکھا۔اس نے ان کے پاس جا کر بہت لجاجت سے درخواست کی۔

''منہ مانگے دام لیجئے یہ ڈبا مجھے دیجئے!

''مگر کیوں؟''۔

''مجھے اپنی لیلیٰ کے لیے چاہئے''۔

''معاف کیجئے۔میں نے یہ آپ کی لیلیٰ کے لیے نہیں، اپنی ملائن کے لیے خریدا ہے''۔

دوسرے دن علی الصباح مجنوں ''کیو'' میں کھڑی ہو گئے اور انہیں فارن پاؤڈر کا ایک ایک ڈبا مل گیا۔

سوالات کے جوابات کے لیے ایک مجنوں نے اس ماہرِ اقتصادیات سے رجوع کیا جو ایک یونیورسٹی میں پروفیسر تھا اور جس کی لیاقت کی سارے ملک میں دھوم تھی۔اس نے ایک معقول فیس وصول کرنے کے بعد یہ جوابات لکھوائے۔

گرانی کے دنوں میں تین چیزوں کا سہارا لے کر ہی زندہ رہا جا سکتا ہے وہ ہیں خیرات، قرض اور رشوت!

آبادی کو صرف شرح اموات کو بڑھا کر ہی کم کیا جا سکتا ہے۔اگر تمام اسپتال اور مطب بند کر دیے جائیں اور ڈاکٹروں، حکیموں اور ویدوں کا پیشہ غیر قانونی قرار دے دیا جائے تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

دوسرے مجنوں نے ایک ایسے عالم کی خدمات حاصل کیں جو عالم ہونے کے ساتھ ہی ستم ظریف بھی تھا۔اس نے یہ جوابات تجویز کیے۔

گرانی کے دنوں میں سال میں چھے مہینے روزے رکھ کر ہی زندہ رہا جا سکتا ہے۔

بڑھتی ہوئی آبادی کا علاج یہ ہے کہ ہر نئی نویلی دلہن اس مقولے یا فارمولے پر عمل کرے

پہلا بچہ ابھی نہیں سچ پوچھو تو کبھی نہیں

دونوں مجنوؤں نے سیمنٹ اور پاؤڈر اور سوالات کے جوابات لیلیٰ کو بھجوا دیئے۔ججوں نے

سیمنٹ اور پاؤڈر کے بارے میں ماہرین کی رائے طلب کی، انہوں نے انہیں ٹیسٹ کرنے کے بعد جو رپورٹ بھجوائی۔ اسے پڑھ کر لیلیٰ ہی کے نہیں دونوں مجنوؤں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ لکھا تھا..... ''اس سیمنٹ میں پچاس فی صد ریت، تیس فی صد راکھ اور بیس فی صد پسا ہوا باجرہ ہے''۔

''پاؤڈر میں پچاس فی صد میدہ اور پچاس فی صد چونا ہے''۔

ججوں نے جب سوالات کے جوابات ملاحظہ کیے تو انہیں یکسر ناتسلی بخش پایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں مجنوؤں کو رد کر دیا گیا۔

اس دردناک قصے کا طرب انگیز پہلو یہ ہے کہ لیلیٰ ابھی تک کنواری ہے! اگر آپ قسمت آزمائی کرنا چاہیں تو غالباً اسے کوئی عذر نہ ہوگا۔ خالص سیمنٹ اور فارن فیس پاؤڈر حاصل کرنے کا انتظام خود کر لیجئے۔ رہے دو سوالات، ان کے صحیح جوابات ہم بتائے دیتے ہیں۔

گرانی کے دنوں میں زندہ رہنے کا راز گھر کے لیے زیادہ سے زیادہ چیزیں خریدنے میں نہیں بلکہ گھر کی زیادہ چیزیں فروخت کرنے میں ہے۔

بڑھتی ہوئی آبادی پر قابو پانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ ایک خاص آرڈی نینس کے ذریعہ شادی کی عمر لڑکے کے لیے پینسٹھ سال اور لڑکی کے لیے ساٹھ سال مقرر کر دی جائے۔

☆☆☆

آغا خنجر

اب تو یاد نہیں ہم نے آغا خنجر کو پہلی بار کہاں تقریر کرتے ہوئے سنا۔ البتہ اتنا خیال آتا ہے، تقریر سننے کے بعد محسوس کیا تھا کہ ان کا کوئی نام اور تخلص ہو سکتا ہے، وہ خنجر ہی ہے۔ ان کا ہر فقرہ خنجر کی طرح دل میں اتر رہا تھا، سامعین پر وجد کا عالم طاری تھا، بات بات پر سبحان اللہ کا ڈونگرا برس رہا تھا، وہ تقریر نہیں کر رہے تھے، جادو جگا رہے تھے۔ ہم نے جب اپنا تقابل ان سے کیا تو بے اختیار اپنی کم مائیگی پر ترس آیا۔ ایک ہم ہیں کہ اسٹیج پر آتے ہی ٹھنڈے پسینے چھوٹنے لگتے ہیں، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگتا ہے، کوشش کے باوجود جب کوئی کام کی بات نہیں کر سکتے، بغلیں جھانکنے لگتے ہیں اور سامعین ہماری بے بسی سے لطف اندوز ہو کر بغلیں بجانے لگتے ہیں۔ متعدد بار جلسوں میں خفت اٹھانے کے بعد ہم نے سوچا کیوں نہ آغا صاحب سے

رجوع کیا جائے اور وہ تمام رموز و نکات حاصل کیے جائیں جو ایک مقرر کے لیے لازمی قرار دیئے گئے ہیں۔

چنانچہ ایک دن ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی۔ ''آپ جادوگر ہیں۔ آپ کی نظر عنایت خاکسار پر ہو جائے تو یہ ذرہ بھی آفتاب بن سکتا ہے''۔

خوش قسمتی سے وہ بہت اچھے موڈ میں تھے۔ مسکرا کر فرمایا۔

''ریاض کے بغیر کسی فن پر عبور حاصل کرنا ناممکن ہے۔ پہلے یہ بتایئے آپ ریاض کرلیں گے؟''۔

''جی ہاں۔ کیوں نہیں، کتنے دن ریاض کرنا ہوگا؟''

''دن نہیں سال، کم از کم سات سال''۔

''اتنا طویل ریاض تو ہم نہیں کر سکتے!''۔

''کیا آپ اسٹیج پر یک لخت رونے یا ہنسنے کی ایکٹنگ کر سکتے ہیں''؟

''کبھی تجربہ نہیں کیا۔ ویسے یہ بھی اتنا آسان نہیں معلوم ہوتا''۔

''کیا تقریر کرتے وقت میز پر اس زور سے مکا مار سکتے ہو کہ وہ ٹوٹنے سے بال بال بچ جائے''۔

''اتنے زور سے تو مکا نہیں مار سکتے''۔

''کیا غالب کے اشعار ذوق سے، ذوق کے داغ سے اور داغ کے امیر مینائی سے منسوب کر سکتے ہو؟''۔

''بالکل نہیں''۔

آغا صاحب نے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ کہا۔

''آپ سب کچھ بن سکتے ہیں، مقرر نہیں بن سکتے!''۔

ان کے اس دوٹوک فیصلے کو سن کر بہت مایوسی ہوئی۔ نیز یہ انکشاف ہوا، ایک کامیاب مقرر بننے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔ ہم نے ایک دوست سے مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے؟ اس نے کہا آئندہ آپ آغا صاحب کی تقریروں کو سننے کے بعد ان کا تجزیہ کیا کریں کہ وہ سامعین کو متاثر کرنے کے لیے کون سے حربوں کا استعمال کرتے ہیں۔ ہمیں یہ مشورہ پسند آیا۔ اس شام آغا صاحب قصابوں کی انجمن میں تقریر کر رہے تھے، ہم وہاں پہنچے۔ آغا صاحب

جھومتے جھامتے اسٹیج پر آئے۔ سامعین پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی۔ دو ایک بار کھانس کر گلا صاف کیا اور پھیپھڑوں کی پوری طاقت استعمال کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا:

ہم نے ان کے سامنے پہلے تو خنجر رکھ دیا
پھر کلیجہ رکھ دیا، دل رکھ دیا، سر رکھ دیا

سامعین نے تالیاں پیٹ کر داد دی۔ اتنے میں انہوں نے دوسرا شعر پڑھ دیا

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

سامعین نے پھر تالیاں پیٹیں۔ آغا صاحب نے جوش میں آ کر فرمایا

''حضرات! کسی شاعر کا مصرع ہے ع

وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

ثواب کا یہ مسئلہ واقعی الٹا ہے۔ یعنی وہی بات الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے، اب دیکھئے نا۔ لوگ شکایت کرتے ہیں، انہیں اچھا گوشت نہیں ملتا۔ ہم پوچھتے ہیں، اچھے بکرے کہاں ملتے ہیں جو اچھا گوشت ملے۔ اچھے بکرے تو پر لگا کر یوں اڑ گئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔ حضرات! ایک محاورہ ہے۔ الٹی چھری سے حلال کرنا۔ مجھے داغ کا شعر یاد آ گیا:

نگاہ پھیر کے عذر وصال کرتے ہیں
مجھے وہ الٹی چھری سے حلال کرتے ہیں

حالانکہ آپ نے کبھی کسی بکرے کو الٹی چھری سے حلال نہیں کیا لیکن لوگ ہیں کہ آپ کو الٹی چھری سے حلال کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ مگر وہ یاد رکھیں:

قریب ہے اب تو روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر
جو چپ رہے گی زبان خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا!

ہم نے ان کی اس تقریر کا تجزیہ کرنے سے پہلے مناسب سمجھا کہ ان کی دو ایک تقریریں اور سن لی جائیں۔ چنانچہ جب ہمیں پتا چلا، وہ ایک مقامی کالج میں طلبہ سے خطاب کر رہے ہیں۔ ہم نے ان کی یہ تقریر سننے کا تہیہ کیا۔ انہوں نے فرمایا:

''دوستو! عزیزو! رفیقو! ہم وطنو! آج تم پر طرح طرح کے الزام تراشے جا رہے ہیں۔ تہمتیں لگائی جا رہی ہیں، کوسنے دیئے جا رہے ہیں، کہا جا رہا ہے تم مغرور ہو، متکبر، بے شعور ہو۔ حالانکہ بات صرف اتنی ہے تم معذور اور مجبور ہو۔ ہم پوچھتے ہیں کون سی صدی اور کون سے ملک میں طلبہ نے اپنے بزرگوں کے خلاف بغاوت کا علم بلند نہیں کیا۔ انگلستان میں نہیں کیا آسٹریلیا میں نہیں کیا، ایران میں نہیں کیا، لنکا میں نہیں کیا، افغانستان میں نہیں کیا۔ اگر یہ صحیح ہے ایسا ہر جگہ ہوا ہے تو پھر صرف آپ ہی کو کیوں گردن زدنی ٹھہرایا جائے، آپ ہی کو کیوں نشانہ مشق بنایا جا رہا ہے، آپ ہی کو کیوں سولی پر چڑھایا جا رہا ہے، سچ تو یہ ہے۔ اس عہد میں سب کچھ ہے، پر انصاف نہیں ہے۔''

ایک اور تقریر انہوں نے ایک پبلک جلسے میں کی، جس میں سامعین کو آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ''حضرات! کیا آپ جانتے ہیں ہمارے ملک میں پچھلے سال پانچ کروڑ سات لاکھ لٹر شراب پی گئی، تین ارب اٹھانوے کروڑ پچاس لاکھ سگرٹ پئے گئے، چالیس لاکھ ٹن چائے نوش کی گئی، سات ارب اسی کروڑ انڈے کھائے گئے، ان اعداد و شمار سے صاف ظاہر ہے قوم کا اخلاق تباہ ہو چکا ہے۔

اخلاق؟ کہاں ہے اخلاق؟ ہر طرف بداخلاقی کا دور دورہ ہے۔ اب ذرا جرائم کے اعداد و شمار ملاحظہ فرمایئے۔ پانچ لاکھ سات ہزار چوری اور ڈاکے کی وارداتیں، چھیاسی ہزار نو سو ننانوے اغوا، ایک لاکھ تین ہزار دو سو قتل! کہاں ہیں اخلاق کے دعویدار اور ثنا خواں؟ کیا یہی وہ تمدن ہے جس کا ذکر کرتے وقت ان کی گردنیں اکڑ جاتی ہیں۔ حالانکہ شرم سے سر جھک جانا چاہئے!''

ہم نے جب ان تقریروں کا تجزیہ کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ آغا خنجر والی بات پیدا کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ وہ واقعی امامِ فن ہیں۔ انہوں نے عوام کی نفسیات کو گہرا مطالعہ کیا ہے۔ وہ جانتے ہیں سامعین فرسودہ اشعار پسند کرتے ہیں، سستی خطابت پر سر دھنتے ہیں اور فرضی اعداد و شمار پر فوراً ایمان لے آتے ہیں۔ ان تینوں خوبیوں کو پیدا کرنے کے لیے ریاض کی ضرورت ہوتی ہے۔ آغا صاحب نے بجا فرمایا تھا۔ ریاض کے بغیر کسی فن پر عبور حاصل کرنا ناممکن ہے۔

☆☆☆

کس طرح خوش رکھا جا سکتا ہے؟

بیوی کو!

کچھ لوگ جو پیدائشی قنوطی یعنی نراشاوادی واقع ہوئے ہیں۔ وہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں، بیوی کس طرح بھی خوش نہیں رہ سکتی، چاہے شوہر اسے بارمسالے کی چاٹ کھلائے یا اس کے لیے آسمان سے تارے توڑ کر لائے۔ خدا کا شکر ہے، ہم قنوطی نہیں۔ ہمارا خیال ہے بیوی کو خوش کیا جا سکتا ہے اور کیا گیا ہے۔ ضرورت صرف تھوڑی سی دانش مندی کی ہے۔ اگر شوہر یہ نکتہ سمجھ لے کہ اس کی بیوی بھی اس کی طرح گوشت پوست کی بنی ہوئی ہے، اس کے سینے میں دل اور کھوپڑی میں دماغ ہے، وہ موم کی گڑیا نہیں اور نہ ہی موم کی ناک ہے، جسے جدھر چاہو موڑ لو، تو گویا اس نے بیوی کو خوش کرنے کی آدھی جنگ جیت لی اور اگر وہ یاد رکھے کہ بیوی خدا کی وہ حساس اور جذباتی مخلوق ہے، جس کے سلون کو شوہر کی ہلکی سے ہلکی بے رخی تباہ کر سکتی ہے تو گویا اس نے بیوی کو خوش کرنے کی ساری جنگ جیت لی۔

دراصل جب بیوی کی کسی معمولی سی فرمائش کو نظر انداز کیا جاتا ہے وہ شوہر کو دل ہی دل میں مخاطب کرتے ہوئے کہتی ہے

تو نے پھیری لاکھ نرمی سے نگاہ
دل کے آئینے میں بال آ ہی گیا

اس لیے بیوی کو خوش کرنے کا پہلا گر یہ ہے کہ اس کی معمولی فرمائشوں کو بھی پورا کیا جائے۔ اگر وہ ایک خاص قسم کا بٹوہ یا جوتا خریدنے پر اصرار کرتی ہے اسے یہ کہہ کر منع نہ کیا جائے۔ ''آپ کے پاس پہلے ڈھیر سارے بٹوے اور جوتے ہیں، اب اور خرید کر کیا کیجئے گا، کیا ان کی دکان کھولنے کا ارادہ ہے''۔ اس طرح اگر وہ کہے۔ ''اس کی رسٹ واچ پرانی ہوگئی ہے اور وہ نئی رسٹ واچ لینا چاہتی ہے''۔ تو اس سے یہ مت کہئے۔ ''تنخواہ میں گھر کا گذارہ تو ہوتا نہیں، نئی رسٹ واچ کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ آپ کی رسٹ واچ ابھی بھلی چنگی ہے بے شک صحیح وقت نہیں بتاتی۔ لیکن جو کچھ بھی بتاتی ہے، اس سے صحیح وقت کا اندازہ تو کیا جا سکتا ہے''۔

ایسا کہنا ایک بہت بڑا خطرہ مول لینے کے مترادف ہوگا، اس لیے چاہے آپ کو قرض لینا

پڑے یا اپنی رسٹ واچ فروخت کرنی پڑے، آپ اسے نئی رسٹ واچ خرید دیجئے۔

ہر ایک بیوی کو اپنے میکے سے بے پناہ عقیدت اور محبت ہوتی ہے۔ اصل میں میکہ اسے اپنی جان سے بھی عزیز ہوتا ہے۔ چاہے وہ میکے میں سوکھے ٹکڑے چبایا کرتی تھی اور سسرال میں پکوان کھا رہی ہے، وہ ہمیشہ یہ کہے گی میکے میں اسے جو نعمتیں میسر تھیں، وہ سسرال میں نہیں ہیں، حالانکہ یہ ایک قسم کی خود فریبی یا غلط فہمی ہے لیکن خیریت اسی میں ہے کہ بیوی کو اس میں مبتلا رہنے دیا جائے۔.....اس لیے اگر وہ آپ پر محض رعب جمانے کے لیے کہے۔ ''میرے والد اور والدہ ضیافتوں پر روپیہ پانی کی طرح بہایا کرتے تھے''۔ تو یہ جانتے ہوئے بھی کہ آپ کے سُسر اور ساس کو خدا نے ساری عمر توفیق ہی کب دی وہ کسی کی ضیافت کر سکتے بلکہ وہ دونوں تو ہمیشہ غیروں کی ضیافتیں اڑاتے رہے۔ آپ یہی کہیں۔ ''اس میں کوئی شک نہیں انہیں روپے کی بجائے مہمانوں کی خاطر تواضع زیادہ عزیز تھی''۔ اگر وہ یہ انکشاف کرے:

''میرے بھائی جیسا ذہین، ایمان دار شخص پیدا ہوا ہے نہ ہوگا''۔ آپ اس کی تردید کرتے ہوئے یہ مت کہیں ''میں نے اس جیسا بیوقوف، بے ایمان اور بزدل شخص آج تک نہیں دیکھا''۔ جب کبھی بیوی کو ضرورت سے زیادہ خوش کرنا مقصود ہو، اس کے میکے کی اتنی تعریف کرنی چاہئے جتنی وہ خود بھی نہ کر سکتی ہو۔ چنانچہ اس کے میکے کی امارت، شرافت اور عظمت کے ایسے قصے گھڑیئے کہ بڑے سے بڑا افسانہ طراز بھی سنے تو دانتوں میں انگلیاں دبا کر رہ جائے۔

اگر یہ سوال کیا جائے، عورت سب سے زیادہ کیا پسند کرتی ہے۔ مختلف شوہر مختلف جوابات دیں گے۔ جوڑے میں لگانے کے لیے پھول، آئے دن ایک نئی ساڑھی، سال چھماہے سونے کا زیور، میک اپ کا سامان جو درآمد کیا گیا ہو۔ یہ سب جوابات اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں، لیکن صحیح ترین جواب یہ ہے۔ ستائش کے جملے!.....ایک سمجھ دار شوہر وہی ہے جو گاہے گاہے بیوی سے سرگوشی کے انداز میں کہتا ہے:

''یہ درست ہے میرے پاس دولت نہیں، شہرت نہیں، کوٹھی نہیں، کار نہیں۔ پھر بھی خدا کا شکر بجالاتا ہوں کہ میرے پاس ایک خوبصورت، ذہین اور فرمانبردار بیوی تو ہے۔ یہ ایک ایسی نعمت ہے جس پر ہزاروں نعمتیں قربان کی جاسکتی ہیں''۔

ستائش کے ان چند جملوں کو سن کر بیوی کا دل باغ باغ ہو جائے گا اور وہ پہلے سے کہیں

زیادہ شوہر کی خدمت کرے گی۔ ستائش کا ایک اور طریقہ اپنی بیوی کا دوسروں کی بیویوں سے موازنہ کرنا بھی ہے۔ مثلاً ہمارے باس کی بیوی کو نہ کام کرنے کا طریقہ آتا ہے نہ بات کرنے کا سلیقہ اتنی پھوہڑ واقع ہوئی ہے کہ گنوار سے گنوار عورت بھی اس سے زیادہ سمجھ دار ہوگی۔ سچ ہے۔ اگر ہم نے پچھلے جنم میں موتی دان دیئے ہوتے تو ہمیں بھی اس قسم کی بیوی ملتی''۔

ستائش سے ملتا جلتا اور ایک حربہ ہے جس کا استعمال بیوی کو خوش کرنے کے لیے کیا جا سکتا ہے اور وہ ہے جان بوجھ کر جھوٹ بولنا۔ مثال کے طور پر اگر بیوی ہمسائی کو کالی ساڑھی پہنے ہوئی دیکھ کر سوال کرے۔ ''کیوں جی۔ اگر میں کالی ساڑھی پہنوں تو کیسی لگوں گی؟ تو آپ جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہوئے جواب دیں۔ ''آپ ایسے لگیں گی جیسے یک لخت قندیل میں شمع روشن ہوگئی ہے یا بادلوں میں مہتاب چمک رہا ہے''۔ اگر آپ نے صداقت سے کام لیتے ہوئے کہہ دیا۔ ''ہمسائی تو گوری چٹی ہے، اسے کالی ساڑھی زیب نہیں دے گی تو اور کسے دے گی۔ آپ سانولی رنگت کی ہیں۔ کالی ساڑھی پہن کر اماوس کی رات لگیں گی''۔ وہ آپ کو ساری عمر معاف نہیں کرے گی۔ اسی طرح جب وہ آپ سے پوچھے۔ ''یہ نیا سوٹ پہن کے میں کیسے لگتی ہوں؟ تو اس سوال کا جواب یہ نہیں۔ ''جیسی آپ پرانا سوٹ پہن کر لگتی ہیں''۔ بلکہ یہ ہے۔ ''ایک دم وحیدہ رحمان''۔ اگر وہ ترمیم پیش کرے۔ ''وحیدہ رحمان نہیں شرمیلا ٹیگور!'' تو آپ کہیں ''بلاشک''۔

کہتے ہیں ٹالسٹائی، کارلائل اور غالب اپنی اپنی بیویوں کو کبھی خوش نہ کر سکے۔ کاش انہیں بیوی کو خوش کرنے کے یہ گر معلوم ہوتے اور وہ اپنی ازدواجی زندگی جہنم کی بجائے جنت بنا سکتے۔

☆☆☆

شوہر کو!

آموں اور سانپوں کی طرح شوہروں کی بے شمار قسمیں ہوتی ہیں۔ مثلاً شوہر جو بیوی کو زرخرید باندی سمجھتے ہیں، شوہر جو چنگیز خاں زیادہ اور شوہر کم ہوتے ہیں، شوہر جو بیوی کو پسند نہیں کرتے، اسے برداشت کرتے ہیں۔ ایک خاص قسم کے شوہر کو ایک خاص قسم کا فارمولا استعمال کر کے ہی خوش رکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی کا شوہر شاعر یا تک بند ہے تو اس کی بیوی کو ہر روز اس سے تازہ اشعار سنانے کی فرمائش کرنی چاہئے اور اشعار کتنے ہی بے جان اور بے ہودہ کیوں نہ ہوں، اتنی داد دینی چاہیے کہ وہ اس ساری ندامت کو بھول جائے۔ جو اسے مشاعرہ میں غزل

پڑھ کر اٹھانا پڑی تھی۔ اس کے برعکس اگر کسی کا شوہر بیوپاری ہے تو اس سے شعر سنانے کی فرمائش کرنے کی بجائے گڑ کا بھاؤ پوچھنا چاہیے، یا یہ سوال کرنا چاہیے کہ مونگ پھلی دہلی میں مہنگی اور لکھنؤ میں سستی کیوں ہے؟۔

تاہم چند باتوں میں تمام شوہر ایک جیسے ہوتے ہیں۔ مثلاً شوہر چاہے معمولی کلرک ہو چاہے بہت بڑا افسر، اور چاہے وہ دفتر میں سارا دن گپیں ہانکے یا جھک مارے، اس کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ جب وہ گھر لوٹے تو اس کی بیوی اسے دیکھ کر یہ سمجھے کہ وہ اس حد تھک گیا ہے، اس لیے اسے آرام کے علاوہ تفریح کی اشد ضرورت ہے۔ ایک سمجھ دار بیوی یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا شوہر تھکا ہوا نہیں بلکہ تھکا ماندہ ہونے کی ایکٹنگ کر رہا ہے، اس کا استقبال ایک دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ کرتی ہے اور فوراً گرم چائے کا پیالہ اس کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہتی ہے۔ ''معلوم ہوتا ہے آج آپ نے بہت کام کیا ہے۔ چائے پی کر لیٹ جائیے تاکہ میں آپ کا سر دباؤں''۔ اس کے برعکس ایک بے سمجھ بیوی شوہر کے گھر قدم رکھتے ہی فرمائشوں کی بوچھاڑ کر دیتی ہے ''آٹا پسوالائیے، بچے کو ڈاکٹر کے پاس لے جائیے، کوئلہ ختم ہو گیا ہے ابھی لا کر دیجئے، نہیں تو رات کو کھانا نہیں پکے گا''۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ چڑ جاتا ہے۔ اول تو کوئی فرمائش پوری نہیں کرتا اور کرتا ہے تو بے دلی کے ساتھ..... شوہر کو خوش رکھنے کے معاملے میں کوئی بیوی جاپانی بیوی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وہ جب خاوند کو اداس اداس یا کھویا کھویا دیکھتی ہے تو اسے معقول رقم دے کر کسی ''گیشیا'' یعنی رقاصہ کے ہاں جانے کے لیے کہتی ہے جس کی صحبت میں چند لمحے گزارنے کے بعد شوہر اپنے آپ کو تازہ دم محسوس کرنے لگتا ہے۔ ایک ہندوستانی بیوی کو یہ طریقہ ہرگز استعمال نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ شوہر کو گیشیا کے گھر جانے کا چسکا پڑ جائے گا، اور وہ ہر شام شکایت کرے گا کہ آج پھر ضرورت سے زیادہ تھک گیا ہے۔

ہر ایک شوہر کی صفت بھونرے سے ملتی جلتی ہے۔ شادی ہونے کے کچھ عرصے بعد اسے دوسروں کی بیویاں زیادہ خوبصورت لگنے لگتی ہے۔ چنانچہ ایک دن وہ مسز اندو کے لمبے بالوں کی تعریف کرتا ہے تو دوسرے دن بیگم عندلیب کی آنکھوں کی اور کسی دن مسز نسیم کی آواز کی۔ ایک سمجھ دار بیوی دوسری عورتوں کی تعریف سن کر بدظن نہیں ہوتی بلکہ مناسب موقع محل دیکھ کر شوہر کو مخاطب کر کے فیض احمد فیض کا یہ شعر پڑھ دیتی ہے:

آ مری جان مرے پاس انگیٹھی کے قریب
جس کے آغوش میں یوں ناچ رہے ہیں شعلے
جس طرح دور کسی دشت کی پہنائی میں
رقص کرتا ہو کوئی بھوت کہ جس کی آنکھیں
کرم شب تاب کی مانند چمک اٹھتی ہیں
ایسی تشبیہہ کی لذت سے مگر دور ہے تو
تو کہ اک اجنبی انجان سی عورت ہے جسے
رقص کرنے کے سوا اور نہیں کچھ آتا
اپنے بے کار خدا کے مانند

دوپہر کو جو کبھی بیٹھے ہوئے دفتر میں
خودکشی کا مجھے یک لخت خیال آتا ہے
میں پکار اٹھتا ہوں یہ جینا بھی ہے کیا جینا
اور چپ چاپ دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں

آ مری جان میرے پاس انگیٹھی کے قریب
تا کہ میں چوم ہی لوں عرض گلفام ترا
اور ارباب وطن کو یہ اشارہ کر دوں
اس طرح لیتا ہے اغیار سے بدلہ شاعر
اور شب عیش گذر جانے پر
بہر جمع و رم و دام نکل جاتا ہے
ایک بوڑھے سے تھکے ماندے سے رہوار کے پاس
چھڑ کر بستر سنجاب و سمور

(نظم سن کر سامعین پر وجد کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ ہیرا جی یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔ یہ نظم اس صدی کی بہترین نظم ہے۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ اگر ایک طرح سے دیکھا جائے تو

اس میں انگلینڈ، بھوت اور دفتر تہذیب وتمدن کی مخصوص الجھنوں کے حامل ہیں)

(حاضرین ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے زیر لب مسکراتے ہیں)

غالب:۔ ارشد صاحب معاف کیجئے، آپ کی یہ نظم کم از کم میرے فہم سے تو بالاتر ہے۔

غیظ احمد غیظ:۔ یہ صرف ارشد پر ہی کیا منحصر ہے۔ مشرق کی جدید شاعری ایک بڑی حد تک مبہم، اور ادراک سے بالاتر ہے۔

م۔ن۔ ارشد:۔ مثلاً میرے ایک دوست کے اس شعر کو لیجئے۔

پاپوش کی کیا فکر ہے دستار سنبھالو
پایاب ہے جو موج گذر جائے گی سر سے

اب بتائیے اس شعر کا کیا مطلب ہے؟

غالب:۔ (شعر کو دہرا کر) صاحب سچ تو یہ ہے کہ اگرچہ اس شعر میں سر اور پیر کے الفاظ شامل ہیں مگر باوجود ان کے اس شعر کا نہ سر ہے نہ پیر۔

م۔ن۔ ارشد:۔ اجی چھوڑیئے اس حرف گیری کو۔ آپ اس شعر کو سمجھے ہی نہیں۔ مگر خیر اس بحث میں کیا رکھا ہے۔ کیوں نہ اب ڈاکٹر قربان حسین خالص سے درخواست کی جائے کہ اپنا کلام پڑھیں۔

ڈاکٹر خالص:۔ میری نظم کا عنوان ہے ''عشق'' عرض کیا ہے۔

عشق کیا ہے؟
میں نے اک عاشق سے پوچھا
اس نے یوں رو کر کہا
عشق ایک طوفان ہے
عشق ایک سیلاب ہے
عشق ہے ایک زلزلہ
شعلہ جوالہ۔۔ عشق
شعلہ ہے پیغام موت

غالب:۔ بھئی یہ کیا مذاق ہے۔ نظم پڑھئے، مشاعرے میں نثر کا کیا کام؟

ڈاکٹر خالص:۔ (جھنجھلا کر) تو آپ کے خیال میں یہ نثر ہے؟ یہ ہے آپ کی سخن فہمی کا عالم اور فرمایا تھا آپ نے۔ ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں۔

غالب:۔ میری سمجھ میں تو نہیں آیا کہ یہ کس قسم کی نظم ہے۔ نہ ترنم، نا قافیہ، نہ ردیف

ڈاکٹر خالص:۔ مرزا صاحب۔ یہی تو جدید شاعری کی خصوصیت ہے۔ آپ نے اردو شاعری کو قافیہ اور ردیف کی فولادی زنجیروں میں قید کر رکھا ہے۔ ہم نے اس کے خلاف جہاد کر کے اسے آزاد کیا ہے اور اس طرح اس میں وہ اوصاف پیدا کیے ہیں جو محض خارجی خصوصیات سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ میری مراد رفعت تخیل، تازگی افکار اور ندرت فکر سے ہے۔

غالب:۔ رفعت تخیل، کیا خوب کیا پرواز ہے

میں نے اک عاشق سے پوچھا، اس نے یوں رو کر کہا

ڈاکٹر خالص:۔ (چڑ کر) عاشق رو کر نہیں کہے گا تو کیا قہقہہ لگا کر کہے گا؟ مرزا آپ یہ بھی نہیں جانتے کہ عشق اور رونے میں کتنا گہرا تعلق ہے۔

غالب:۔ مگر آپ کو قافیہ اور ردیف ترک کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

رفیق احمد خوگر:۔ اس کی وجہ مغربی شعرا کا تتبع نہیں بلکہ ہماری طبیعت کا فطری میلان ہے جو زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح شعر و ادب میں بھی آزادی کا جویا ہے۔ اس کے علاوہ دور جدید کی روح انقلاب، کشاکش تحقیق، تجسس، تعقل پرستی اور جدوجہد ہے۔ ماحول کی اس تبدیلی کا اثر ادب پر ہوا ہے اور میرے اس نکتے کو تھیکرے نے بھی اپنی کتاب وینٹی فیئر میں تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ اسی لیے ہم نے محسوس کیا کہ قدیم شاعری ناقص ہونے کے علاوہ روح میں وہ لطیف کیفیت پیدا نہیں کر سکتی جو مثال کے طور پر ڈاکٹر خالص کی شاعری کا جوہر ہے۔ قدیم شعرا اور جدید شعرا کے ماحول میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ قدیم شعرا بقول مولانا آزاد، حسن و عشق کی حدود سے باہر نہ نکل سکے اور ہم جن میدان میں گھوڑے دوڑا رہے ہیں نہ ان کی وسعت کی انتہا ہے اور نہ ان کے عجائب و لطائف کا شمار۔

غالب:۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

م۔ ن۔ ارشد:۔ خوگر صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم ایک نئی دنیا میں رہتے ہیں۔ یہ ریڈیو، ہوائی جہاز اور دھماکے سے پھٹنے والوں بموں کی دنیا ہے۔ یہ بھوک، بیکاری، انقلاب اور آزادی کی دنیا ہے۔ اس دنیا میں رہ کر ہم اپنا وقت حسن و گل و بلبل، شیریں فرہاد کے افسانوں میں ضائع نہیں کر سکتے۔ شاعری کے لیے اور بھی موضوع سخن ہیں۔ جیسا کہ ہمارے ایک شاعر نے کہا

آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سائے تلے
آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گزری ہے
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی، اجداد پہ کیا گزری ہے
یہ حسین کھیت پھٹا پڑتا ہے جو بن جن کا
یہ ہر ایک سمت پر اسرار کڑی دیواریں
یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے

راجہ علی مہدی خاں: ۔ بہت خوب۔ یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے۔ ایسے ہی مضامین میں سے ایک مضمون ''ڈاک خانہ'' ہے۔ جو میری اس نظم کا جو میں ابھی آپ کے سامنے پڑھوں گا، موضوع ہے۔

غالب: ۔ ڈاک خانہ؟

راجہ علی مہدی خاں: ۔ مرزا اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ سنئے عرض کیا ہے۔

ڈاک خانے کے ہے اندر آہ اف کتنا ہجوم
ڈالنے کو خط کھڑے ہیں کس قدر اف آدمی
ان میں ہر ایک کی تمنا ہے کہ وہ
ڈال کر جلدی سے خط یا پارسل
بھاگ کر دیکھے کہ اس کی سائیکل
ہے پڑی باہر جہاں رکھ کر اسے
ڈاک خانے میں ابھی آیا تھا وہ خط ڈالنے
جا رہے ہیں خط چہار اطراف کو
بمبئی کو، مصر کو لندن کو کوہ قاف کو
دیکھنا۔ آئی ہے اک عورت لفافہ ڈالنے
کون کہتا ہے کہ ایک عورت ہے یہ
یہ تو لڑکا ہے۔ کسی کالج کا کہ

جس کے بال
خدوخال
اس قدر ملتے ہیں عورت سے کہ ہم
اس کو عورت کا سمجھتے ہیں بدل
اف ہماری لغزشیں
ہے مگر کس شخص کا یہ سب قصور
کیا نظر میری نہیں کرتی ہے کام
جھٹپٹا سا ہو گیا ہے شام کا
یا ہمارے تمدن کا قصور
کہ ہمارے نوجواں
ڈاک خانے میں ہیں جب آتے لفافہ ڈالنے
اس قدر دیتے ہیں وہ دھوکا ہمیں
کہ نظر آتے ہیں ہم کو عورتیں۔

(زوروں کی داد دی جاتی ہے۔ ہر طرف سے مرحبا، بھئی کمال کر دیا، کے نعرے بلند ہوتے ہیں، مرزا غالب کی سراسیمگی ہر لحہ بڑھتی جا رہی ہے)

م۔ن۔ارشد:۔اب میں ہندوستان کے مشہور شاعر پروفیسر غیظ سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے تازہ افکار سے ہمیں نوازیں۔

پروفیسر غیظ:۔میں نے تو کوئی نئی چیز نہیں لکھی۔

ہیراجی:۔تو پھر وہی نظم سنا دیجئے جو پچھلے دنوں ریڈیو والوں نے آپ سے لکھوائی تھی۔

پروفیسر غیظ:۔آپ کی مرضی تو وہی سن لیجئے۔عنوان ہے ''لگائی''

فون آیا ہے دل زار! نہیں فون نہیں
سائیکل ہو گا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات اترنے لگا کھمبوں کا بخار
کمپنی باغ میں لنگڑانے لگے سرد چراغ

تھک گیا رات کو چلا کے ہر ایک چوکیدار
گل کرو دامن افسردہ کے بوسیدہ داغ
یاد آتا ہے مجھے سرمہ دنبالہ دار
اپنے بے خواب گھروندے ہی کو واپس لوٹو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

(نظم کے دوران میں اکثر مصرعے دو دو بلکہ چار چار بار پڑھوائے جاتے ہیں اور پروفیسر غیظ بار بار مرزا غالب کی طرف دادطلب نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ مرزا غالب مبہوت ہیں)

م۔ن۔ ارشد:۔ حضرات میرے خیال میں یہ کوئی عشقیہ نظم نہیں ہے بلکہ اس میں شاعر نے ملک کے اینٹی فاشٹ جذبے کو خوب نبھایا ہے۔

رقیق احمد:۔ (سرگوشی کے انداز میں ہیراجی سے) بکواس ہے!

م۔ن۔ ارشد:۔ اب ہیراجی اپنا کلام پڑھیں گے۔

ہیراجی:۔ میری نظم کا عنوان ہے ''بینگن''۔

غالب:۔ بینگن؟

ہیراجی:۔ بینگن۔ اگر آپ آم کی صفت میں قصیدہ لکھ سکتے ہیں تو کیا بندہ بینگن پر نظم لکھنے کا حقدار نہیں۔

غالب:۔ معاف کیجئے گا۔ نظم پڑھئے۔

ہیراجی:۔ عرض کیا ہے:۔

چنچل بینگن کی چھب نیاری
رنگ میں تم ہو کرشن مراری
جان گئی ہیں سکھیاں پیاری
رادھا رانی آہی گئی تو!!
کرشن کنہیا ڈھونڈھ رہے ہیں
لیکن میں تو بھول چکا ہوں
بینگن سے یہ بات چلی تھی

بھوک لگی ہے کتنی ہائے
جی میں ہے اک بھون کے بینگن
کھاؤں لیکن رادھا پیاری
رنگ کو اس کے دیکھ کر مجھ کو
یاد آتے ہیں کرشن مراری
اس لیے بھوکا رہنا بہتر
چونکہ میں ہوں پریم پجاری

(ہر طرف سے داد دی جاتی ہے بعض شعرا یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں بھئی جدید شاعری بیراجی کا ہی حصہ ہے)

م۔ن۔ارشد:۔اب جناب بکرماجیت صاحب ورما سے استدعا کی جاتی ہے کہ اپنا کلام سنائیں۔

بکرماجیت ورما:۔مرزا، آپ کے زمانے میں گیت شاعری کی ایک باقاعدہ صنف قرار نہیں دیئے گئے تھے۔دور جدید کے شعرا نے انہیں ایک قابل عزت صنف کا درجہ دیا ہے۔

غالب:۔جی ہاں ہمارے زمانے میں عورتیں، بھانڈ، میراثی یا اس قماش کے اور لوگ گیت لکھا کرتے تھے۔

بکرماجیت:۔پہلا گیت ہے ''برہن کا سندیس'' عرض کیا ہے:۔

اڑ جا دیس بدیس رے کوے اڑ جا دیس بدیس
سُن کر تیری کائیں کائیں

غالب:۔خوب سن کر تیری کائیں کائیں!

بکرماجیت ورما:۔عرض کیا ہے۔

سن کر تیری کائیں کائیں
آنکھوں میں آنسو بھر آئیں
بول یہ نیرے من کو بھائیں
مت جانا پردیس رے کوے اڑ جا دیس بدیس

م۔ن۔ارشد:۔بھئی۔کیا اچھوتا خیال ہے۔پنڈت صاحب میرے خیال میں ایک گیت

آپ نے کبوتر پر بھی لکھا تھا۔ وہ بھی مرزا کو سنا دیجئے۔

بکر ماجیت:۔ سنئے پہلا بند ہے:

بول کبوتر بول!
دیکھ کوئلیا کوک رہی ہے
من میں میرے ہوک اٹھی ہے
کیا تجھ کو بھی بھوک لگی ہے
بول غٹرغوں بول۔ کبوتر
بول کبوتر۔ بول

باقی شعرا:۔ (یک زبان ہوکر) بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول

(اس اثنا میں غالب نہایت گھبراہٹ اور سراسیمگی کی حالت میں دروازے کی طرف دیکھتے ہیں)

بکر ماجیت ورما۔: اب دوسرا بند سنئے:

بول کبوتر بول!
کیا میرا ساجن کہتا ہے
کیوں مجھ سے روٹھا رہتا ہے
کیوں میرے طعنے سہتا ہے
بھید یہ سارے کھول کبوتر
بول کبوتر بول!

باقی شعرا:۔ (یک زبان ہوکر) بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول

اس شور وغل کی تاب نہ لاکر مرزا غالب بھاگ کر کمرے سے باہر نکل جاتے ہیں)

☆☆☆